درس ۱۸

نبی اکرم ﷺ کا بنیادی طریق کار

یا

انقلابِ نبوی ﷺ کا اساسی منہاج

سورۃ الجمعہ کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

سورۃ الجمعہ کے مضامین پر غور وفکر کے ضمن میں بھی ہم وہی طریق کار اختیار کریں گے جو سورۃ الصّف کے ذیل میں اختیار کیا گیا تھا کہ پہلے سورت کی مرکزی آیت کو کماحقہٗ سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اس کے بعد ایک ایک آیت کو غور وفکر کا موضوع بنایا جائے۔ بالخصوص ہر آیت کا جو ربط وتعلق اس مرکزی آیت کے ساتھ بنتا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کے مضامین کا باہمی ربط

یہ بات اس سے پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ میں جوڑے جوڑے ہونے کی وہ نسبت جو قرآن مجید کی اکثر سورتوں میں موجود ہے' بہت ہی نمایاں ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں بلند پایہ سورتیں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے دو پہلوؤں سے بحث کرتی ہیں۔ چنانچہ سورۃ الصّف کا مرکزی مضمون تھا نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت' جبکہ سورۃ الجمعہ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اس مقصد بعثت کے حصول اور اس عظیم مشن کی تکمیل کے لیے آپ ﷺ کا بنیادی طریق کار کون سا تھا! ——— یہاں لفظ ''بنیادی'' خاص طور پر قابل توجہ ہے اور اسے سمجھنے کے لیے ہمیں قدرے تفصیل میں جانا ہوگا۔

اگرچہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اگر ہم عام مروّجہ معنوں میں نبی اکرم ﷺ کو ایک انقلابی رہنما کہیں تو یہ یقیناً آپ ﷺ کی توہین کے مترادف ہوگا' لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ داعیٔ انقلاب کا اطلاق نسل انسانی کے کسی فرد پر اگر بتمام وکمال ہوسکتا ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہیں!! اس لیے کہ تاریخ انسانی کا ہمہ گیر ترین اور گھمبیر ترین انقلاب برپا کرنے کا سہرا بلاشبہ آپ ﷺ ہی کے سر ہے۔

تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب

غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ تاریخ کے دو بڑے بڑے انقلاب جن کا بہت شہرہ ہے' محض جزوی انقلابات تھے۔ انقلابِ فرانس ہو یا انقلابِ روس' ان دونوں نے زندگی کے رخ میں کوئی ہمہ گیر تبدیلی برپا نہیں کی۔ انقلابِ فرانس میں لوگوں کے افکار اور عقائد نہیں بدلے' ان کا طرزِ معاشرت تبدیل نہیں ہوا' صرف نظامِ حکومت کا ڈھانچہ تبدیل ہوا۔ یعنی شخصی حکومت کا دَور ختم ہوا اور جمہوریت کا آغاز ہوا۔ اسی طرح انقلابِ روس (Baolshewik Revolution) اگرچہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا' بلکہ اگر اسے انقلابوں کی ماں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کی کوکھ سے انقلابوں کی ایک پوری کھیپ برآمد ہوئی ہے' بایں ہمہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے ذریعے بھی ایک جزوی تبدیلی ہی آ سکی' یعنی محض نظامِ معیشت کا ڈھانچہ تبدیل ہوا۔ اور ویسے تو کہا جا سکتا ہے کہ ایک بڑا انقلابی فکر یعنی جدلی مادیت (Dialectical Materialism) اس انقلاب کی پشت پر تھا لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو مادیت پہلے سے موجود تھی' اس نے صرف ایک قدم آگے بڑھایا اور جدلی مادیت کی شکل اختیار کر لی' اسے آپ ''مادیت'' سے ''جدلی مادیت'' تک ایک ارتقائی عمل تو کہہ سکتے ہیں' انقلابی عمل نہیں کہہ سکتے۔ گویا کہ وہاں بھی اصل تبدیلی زندگی کے محض ایک گوشے یعنی نظامِ معیشت میں واقع ہوئی کہ کوشش کی گئی کہ ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لے کر

حصہ رسدی تمام افراد تک کسی قدر منصفانہ انداز میں پہنچا دیا جائے۔ اس سے قطع نظر کہ معاشی ڈھانچے میں اس تبدیلی کے ضمن میں انسان کو کیا قیمت ادا کرنی پڑی اور اس کا کیا ردّعمل سامنے آ رہا ہے' فی الوقت صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ دنیا کے یہ تمام انقلابات جزوی تھے' جبکہ نبی اکرم ﷺ کا لایا ہوا انقلاب ہمہ گیر تھا۔ اس انقلاب میں لوگوں کے عقائد بدلے' افکار بدلے' نظریات بدلے' زندگی کی قدریں بدلیں' نقطۂ نظر تبدیل ہو گیا' سوچ کا رُخ بدل گیا' طرزِ بود و باش بدل گئی' معیشت کا انداز بدل گیا' سیاست کے طور واطوار بدل گئے' یوں کہیے کہ زمین بدل گئی' آسمان بدل گیا۔ بلکہ یہاں یہ تلاش کرنا پڑتا ہے کہ کیا چیز نہیں بدلی! —— اس پہلو سے کسی دوسرے انقلاب کو انقلابِ محمدیؐ سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہیں ہو سکتی! چنانچہ اس پہلو سے ہمارے اس دور کے برعظیم پاک و ہند کے ایک بہت بڑے انقلابی ایم این رائے نے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں اپنی مشہور کتاب ''Historical Role of Islam'' میں اگر یہ کہا کہ محمد ﷺ بہت بڑے انقلابی راہنما تھے تو واقعہ یہ ہے کہ غلط نہیں کہا۔

دوسری طرف یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ دنیا کے تمام اہم انقلابات کا اگر مشاہدہ کیا جائے تو ایک بات قریباً ہر جگہ مشترک نظر آئے گی کہ انقلابی فکر تخلیق کرنے والے یا پیش کرنے والے کچھ اور لوگ تھے اور اس انقلاب کو عملاً برپا کرنے کا معاملہ کچھ اور لوگوں کا ہاتھوں ہوا۔ انقلابِ فرانس کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ والٹیئر' روسو اور اُن جیسے نامعلوم کتنے اہل قلم تھے جنہوں نے وہ فکر دیا کہ جس کی بنیاد پر اس انقلابی عمل کا آغاز ہوا۔ لیکن یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ انقلابِ فرانس کے عملاً برپا ہونے اور اس کی عملی رہنمائی میں ان مفکرین کو کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔ وہ انقلاب عملاً کچھ اوباش قسم کے لوگوں کی رہنمائی میں برپا ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ بڑا ہی خونی انقلاب تھا۔ اسی طرح کا معاملہ انقلابِ روس (Baolshewik Revolution) کا بھی تھا۔ اس انقلاب کے لیے انقلابی فکر دینے والا کارل مارکس جو جرمنی کا رہنے والا تھا' خود اپنی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب برپا نہیں کر سکا۔ سوچیے' یہاں ایک بالکل ہی دور دراز کے ملک میں ایک فعال شخصیت لینن کے ہاتھوں وہ انقلاب برپا ہوا جس نے کارل مارکس کے دیے ہوئے فکر و فلسفہ کو دنیا میں ایک انقلاب کی عملی شکل میں ڈھالا۔ معلوم ہوا کہ انقلابی فکر دینے والے بالعموم کچھ اور لوگ ہوتے ہیں اور انقلاب برپا کرنے والے کوئی اور!

اس پس منظر میں دیکھیے تو نبی اکرم ﷺ کا معاملہ منفرد اور ممتاز نظر آتا ہے۔ ایک فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور کل تیئیس برس میں یعنی ایک ''life span'' کے اندر اندر انقلاب کی تکمیل ہو گئی۔ بلکہ یہ تیئیس برس بھی شمسی نہیں قمری ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو ہمارے حساب سے وہ بمشکل بائیس برس بنتے ہیں۔ کل بائیس برس میں ایک شخص فردِ واحد کی حیثیت سے دعوت کا آغاز کرتا ہے اور پھر وہ دعوتی و انقلابی جدوجہد ان تمام مراحل کو طے کر کے جو کسی بھی انقلاب کو درپیش ہوتے ہیں' نہایت خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ اس میں آپ ﷺ کو تمسخر و استہزاء کے ابتدائی مرحلے سے گزرنا پڑا' پھر وہ شدید تشدّد (persecution) کا دور بھی آیا جس میں اہل ایمان پر وحشیانہ مظالم ڈھائے گئے' پھر وہ مرحلہ بھی آیا کہ وطن کو چھوڑنا پڑا' مکے کی سرزمین کو خیر باد کہہ کر مدینہ منورہ کا رُخ اختیار کرنا پڑا' پھر اقدام کا مرحلہ بھی آیا اور جہاد و قتال کے مراحل سے بھی گزرنا پڑے۔ اور اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے تمام مراحل سے گزر کر کل تیئیس برس کی مدت میں وہ انقلاب اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ جس کی طرف توجہ دلانے کے لیے یہ ساری بات گوش گزار کی گئی' یہ نکلا کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں اس انقلابی عمل کے مختلف مراحل بہت نمایاں ہو گئے۔ بلکہ آپؐ کے اس انقلابی عمل کا tempo اتنا شدید ہے اور وہ انسان کی توجہ کو اس درجے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے کہ اس انقلابی عمل کی پشت پر کارفرما اساسی طریق کار بالعموم نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ اساسی طریق کار یا منہجِ عمل اپنی جگہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ اس انقلابی جدوجہد' اس تصادم اور اس تمام تر جہاد و قتال کے لیے وہ افراد کس طور سے حاصل ہوئے کہ جن میں ہر ایک عزم و ہمت

اور استقامت کی چٹان ثابت ہوا۔ ان افراد کے فکرونظر میں انقلاب کیونکر برپا ہوا اور پھر ان کی تربیت کا معاملہ کس نہج پر ہوا! گویا غور طلب بات یہ ہے کہ اس انقلابی عمل کی تہہ میں کارفرما وہ کون سا عمل تھا کہ جس کے ذریعے انفرادی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوا۔ جس طرح کسی پہاڑی ندی کا زور وشور اور اس کی موجوں کا تلاطم انسان کو اس طرح اپنے اندر جذب کر لیتا ہے کہ اس کی گہرائی کی طرف توجہ نہیں ہوتی‘ اسی طرح نبی اکرمﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا یہ پہلو یعنی انقلابی کشمکش اور اس میں تصادم کے مختلف مراحل کسی بھی سیرت کے سننے یا پڑھنے والے کو اس درجے اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں کہ اس جدوجہد کے پس پشت کارفرما اساسی منہاج اور بنیادی طریق کار نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور ساری توجہ اسی ایک پہلو پر مرتکز ہو جاتی ہے۔

انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج

سورۃ الجمعہ میں درحقیقت نبی اکرمﷺ کے اسی اساسی منہاج اور بنیادی طریق کار کو واضح کیا گیا ہے جس کے ذریعے وہ افراد تیار کیے گئے کہ جو اس انقلابی جدوجہد میں نبی اکرمﷺ کے دوست و بازو بنے اور جن کے اندر کا انقلاب بیرونی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیش خیمہ بن گیا۔ اس مضمون کی اہمیت کو اکبر الٰہ آبادی کے ایک شعر کے حوالے سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے‘ بڑا پیارا شعر ہے ؎

خدا کے کام دیکھو‘ بعد کیا ہے اور کیا پہلے!
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

کہ اگرچہ نبی اکرمﷺ کی سیرت طیبہ میں غزوۂ بدر‘ غزوۂ اُحد‘ غزوۂ احزاب‘ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ بڑے اہم نشاناتِ راہ (land marks) شمار ہوتے ہیں لیکن اس وقت ہماری گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ وہ بنیادی process اور طریق کار کون سا تھا کہ جس سے انقلاب کی داغ بیل پڑی‘ جس سے افراد کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوا‘ وہ افراد کہ جنہوں نے اپنی سیرت وکردار سے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا نقشہ وہ ہے جو سورۃ الاحزاب میں بایں طور آیا ہے کہ:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج﴾

’’اہل ایمان میں ایسے جوان مرد موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچا کر دکھایا۔‘‘

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾﴾

’’تو ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے (اور گردنیں کٹوا کر سبکدوش ہو چکے‘ سرخرو ہو چکے) اور باقی ابھی منتظر ہیں (کہ کب ہماری باری آئے اور ہم بھی سبکدوش ہو جائیں اور) انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔‘‘

وہ مردانِ کار کس process سے اور کس طور سے تیار ہوئے تھے‘ یہ ہے درحقیقت سورۃ الجمعہ کا مرکزی مضمون۔

سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت

سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت (یعنی آیت ۲) کے بارے میں پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس میں جو چار اصطلاحات وارد ہوئی ہیں‘ ان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں چار مقامات پر ان کا اعادہ کیا گیا ہے اور یہ ایک نہایت غیر معمولی بات ہے۔ سب سے پہلے سورۃ البقرۃ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی دعا میں وہ الفاظ آئے‘ پھر چند رکوعوں کے بعد اللہ کی طرف سے اس دعا کی قبولیت کے اعلان کے ذکر میں انہی الفاظ کا اعادہ ہوا‘ پھر سورۂ آل عمران میں اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے بیان میں کہ اللہ نے تم پر اپنا ایک رسول بھیج دیا ہے پھر انہی چار اصطلاحات کو دہرایا گیا اور پھر آخری مرتبہ یہ چاروں اصطلاحات یہاں سورۃ الجمعہ میں وارد ہوئی ہیں۔ اور یہاں تو یہ الفاظ یا یہ اصطلاحات گویا کہ اس پوری سورت کے لیے بمنزلۂ عمود ہیں‘ یا یوں کہہ لیجیے کہ انہیں اس سورت کے مرکزی مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے آئیے کہ اس سورۂ مبارکہ پر اور بالخصوص اس کی آیت ۲ پر نگاہوں کو پورے طور پر مرتکز کر دیا جائے۔

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ ۗ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۲﴾

دیکھئے! جس طرح سورۃ الصّف کی مرکزی آیت کا آغاز ہوا تھا: ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ﴾ کے الفاظ سے' اسی طرح سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت کا آغاز ہو رہا ہے ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ کے الفاظِ مبارکہ سے۔ دونوں مقامات پر ایک ہی اسلوب ہے اور نہایت ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ ''وہی اللہ ہے جس نے اٹھایا اُمیین میں ایک رسول انہی میں سے''۔ بعث کے معنی ہیں کسی چیز کا اٹھانا یا برپا کرنا۔ چنانچہ ''بعث بعد الموت'' کی اصطلاح موت کے بعد جی اٹھنے کے مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ لفظ ''اُمّیین'' پر ہم ان شاء اللہ بعد میں گفتگو کریں گے کہ یہ اس سورۂ مبارکہ کے اہم مضامین میں سے ہے۔ ابھی ذرا وقتی طور پر اس لفظ سے توجہ کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھئے۔ اگلے الفاظ اس اعتبار سے نہایت اہم ہیں کہ ان میں رسول کے طریقِ کار یا منہجِ عمل کا بیان ہے کہ وہ رسول جو اللہ نے مبعوث فرمایا ہے' کیا کرتے ہوئے آیا ہے: ﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ ۗ﴾ ''تلاوت کرتا ہے ان لوگوں پر اس کی آیات (یعنی اللہ کی آیات)' اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب اور حکمت کی''۔ آیت کا آخری ٹکڑا حسب ذیل ہے: ﴿وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۲﴾ ''اور اگرچہ وہ اس سے قبل کھلی گمراہی میں تھے''۔

چار اہم اصطلاحات

یہ ہے وہ آیۂ مبارکہ جس کے بارے میں عرض کیا گیا ہے کہ یہ مضمون کے اعتبار سے اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے۔ اس میں چار اصطلاحات وارد ہوئی ہیں: i) تلاوتِ آیات' ii) تزکیہ' iii) تعلیم کتاب' اور iv) تعلیمِ حکمت۔ ان چاروں پر آپ غور کریں گے تو پہلی بات نمایاں ہو کر آپ کے سامنے یہ آئے گی کہ ان چار میں سے کم از کم دو کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ان سے مراد سوائے قرآن کے اور کچھ نہیں! ظاہر بات ہے کہ تلاوتِ آیات سے مراد قرآن مجید کی آیات ہی کا پڑھ کر سنانا ہے۔ اسی طرح تعلیم کتاب سے مراد بھی قرآن حکیم ہی کی تعلیم ہے۔ البتہ دو اصطلاحات سے کتاب اللہ کے سوا کوئی اور شے مراد ہے۔ چنانچہ عمل تزکیہ کے بارے میں ایک گمان یہ ہوسکتا ہے کہ اس کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا اپنا علیحدہ تشخص ہے۔ اسی طرح لفظ ''حکمت'' کے بارے میں بھی ہمارے ہاں ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا اور بعض بڑے بڑے ائمہ دین کی طرف سے' جن میں امام شافعی ؒ بھی شامل ہیں' یہ خیال سامنے آیا ہے کہ اس سے مراد سنّتِ رسولؐ ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے تمام تر احترام کے باوصف یہاں ہمیں یہ غور کرنا ہوگا کہ ان چاروں اصطلاحات کا باہمی ربط وتعلق کیا ہے اور خود قرآن حکیم کے دوسرے مقامات سے ان کا کیا مفہوم متعین ہوتا ہے۔ جس طرح سورۃ العصر کے بارے میں عرض کیا گیا کہ شرائط نجات کے بیان میں وہ چاروں چیزیں جو وہاں بیان ہوئی ہیں ان میں باہم بڑا گہرا معنوی ربط موجود ہے۔ ایمانِ حقیقی کا لازمی نتیجہ عمل صالح ہے۔ اور عمل صالح اگر پختگی کو پہنچے گا تو اس سے تواصی بالحق کے برگ وبار لازماً ظاہر ہو کر رہیں گے۔ اسی طرح اگر صحیح معنی میں حق کی دعوت دی جائے تو یقیناً صبر کا مرحلہ آ کر رہے گا' تکالیف ومشکلات آئیں گی اور انہیں جھیلنا ہو گا۔ تو جس طرح سورۃ العصر کی ان چار اصطلاحات میں باہم گہرا ربط ہے' اسی طرح سورۃ الجمعہ کی متذکرہ بالا چار اصطلاحات بھی باہم مربوط ہیں۔

تزکیے کے بارے میں تفصیلی گفتگو تو بعد میں ہوگی' سر دست اتنی بات نوٹ کر لیجیے کہ قرآن مجید مدعی ہے کہ تزکیہ کا اصل ذریعہ وہ خود ہے۔ سورۂ یونس میں صاف الفاظ میں فرما دیا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ﴾ یعنی ''اے لوگو! تمہارے پاس آ چکی ہے تمہارے ربّ کی طرف سے ایک

موعظت' ایک نصیحت جو شفا ہے تمہارے سینوں کے امراض کے لیے''۔ یہ قرآن تمہارے تمام باطنی اور روحانی امراض کا مداوا بن کر نازل ہوا ہے۔تزکیۂ نفس یا تزکیۂ باطن کا اصل ذریعہ خود قرآن ہے۔اور جہاں تک ''تعلیم حکمت'' کا معاملہ ہے تو اس ضمن میں ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۂ بنی اسرائیل میں وہ آیت وارد ہو چکی ہے جو اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہے کہ حکمت کا اصل سرچشمہ بھی خود قرآن ہی ہے۔ارشاد ہوتا ہے: ﴿ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ ''یہ ہے وہ چیز کہ (اے محمد ﷺ) آپ پر وحی کی ہے آپ کے ربّ نے از قسم حکمت!'' تو معلوم ہوا کہ یہ چاروں اصطلاحات یعنی تلاوتِ آیات' تزکیہ' تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت درحقیقت قرآن مجید ہی کے گرد گھوم رہے ہیں اور ان سب کا محور و مرکز قرآن مجید ہی ہے۔ گویا بالفاظِ دیگر محمد رسول اللہ ﷺ کا آلۂ انقلاب یہی قرآن مجید ہے' جس کے بارے میں مولانا حالی نے بڑے پیارے انداز میں کہا تھا ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخہ کیمیا ساتھ آیا

غور کیجیے' محمد رسول اللہ ﷺ نے افراد کی زندگیوں میں وہ عظیم انقلاب کیسے برپا فرمایا! ان کے فکر اور ان کے کردار میں جو ہمہ گیر تبدیلی آئی وہ کیونکر آئی؟ اس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تمام تبدیلی کی بنیاد اور اساس خود قرآن حکیم ہے۔تو آیئے کہ ہم ان چار اصطلاحات پر اپنی توجہات کو مرکوز کریں!

تلاوتِ آیات

نبی کریم ﷺ کا پہلا کام یا آپ کے فرائض چہارگانہ میں سے پہلا فریضہ ہے تلاوتِ آیات' جس کے لیے یہاں الفاظ لائے گئے: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ —— ''تَلَا' يَتْلُوْ'' اگر کسی صلے کے آئے تو اس کے معنی خود پڑھنے کے ہوتے ہیں اور جب اس پر ''عَلٰی'' کا اضافہ ہو جائے' جیسے ''تَلَا عَلَيْهِ'' تو اس کے معنی ہوں گے کسی کو پڑھ کر سنانا۔ کارِ نبوت یا کارِ رسالت کا سرآغاز یہی تلاوتِ آیات ہے۔ دعوت کا آغاز تلاوتِ آیات ہی سے ہوتا ہے۔

لفظ آیات پر اس سے قبل ہمارے ان اسباق میں گفتگو ہو چکی ہے۔غور کیجیے کہ آیات یا نشانیوں کا حاصل کیا ہے! ہم پڑھ چکے ہیں کہ ان آیات سے اصل مقصود ذہن کو اللہ کی جانب متوجہ کرنا ہے۔ اللہ کی یاد دلوں میں تازہ ہو جائے' اللہ کی معرفت اور اس پر ایمان قلوب میں اُجاگر ہو جائے۔ یہی آیات ہیں کہ جو پھر انسان کو بعث بعد الموت کی طرف اور جزا و سزا کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ گویا ہر اعتبار سے اوّلین کام تلاوتِ آیات ہی بنتا ہے۔قرآن مجید کی حکمتِ نزولی سے ہمیں اس کی مزید تائید ملتی ہے کہ قرآن مجید میں مکی سورتوں میں جو آیات نازل ہوئی ہیں ان سب کا بنیادی موضوع ایک ہی ہے اور وہ ہے توحید' کہ اصل مقصود یہ ہے کہ ایمان باللہ دلوں میں جاگزیں ہو جائے' ہستی باریٔ تعالیٰ کا یقین راسخ ہو جائے' اس کی صفاتِ کمال کا علم حاصل ہو جائے' اس کی توحید پر دل ٹھک جائے' جزا و سزا' بعث بعد الموت' حشر نشر اور جنت و دوزخ پر ایک یقین محکم پیدا ہو جائے' نبوت و رسالت اور انزالِ وحی و کتب کے ضمن میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔ یہ ہے اصل اہمیت کی چیز' یہ ہے کارِ رسالت کا نقطۂ آغاز!

قرآن حکیم کی آیات نے آ کر لوگوں کے ذہنوں سے تمام ملحدانہ خیالات' مشرکانہ عقائد اور اس کائنات اور خود اپنے بارے میں انسان کے قائم کردہ تمام غلط نظریات کو دھو دیا اور صاف کر دیا۔ اس تطہیر ذہنی و فکری کا اصل ذریعہ ہے تلاوتِ آیات!

ایک فرد کے معاملے کو ذہن میں رکھ کر آپ اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایک فرد میں اسلامی انقلاب آ جائے تو ظاہر بات ہے کہ آپ کو سب سے پہلے اس کی سوچ اور اس کے نقطۂ نظر کا جائزہ لینا ہوگا اور اس کے فکر کی اصلاح سے کام کا آغاز کرنا ہوگا۔ اگر آپ چھوٹتے ہی اسے کچھ شعائرِ اسلامی کا احترام کرنے یا نماز روزے کی تلقین کریں گے تو یہ ایک غیر حکیمانہ ترتیب ہوگی۔ آپ کو سب

سے پہلے یہ جائزہ لینا ہوگا کہ اُس شخص کا فکر کیا ہے‘ اس کی سوچ کیا ہے‘ آیا وہ اس کائنات کو محض ایک حادثہ سمجھتا ہے اور اس کا یہ خیال ہے کہ یہ نظام از خود چل رہا ہے یا وہ مانتا ہے کہ اس کا کوئی خالق‘ مالک اور مدبر بھی ہے!! اسی طرح یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ اسی دُنیوی زندگی کا کل زندگی سمجھتا ہے یا حیاتِ بعد موت کا کوئی تصور اس کے ذہن میں موجود ہے! ——اور آیا وہ صرف عقل اور حواس ہی کو اپنے لیے حصولِ علم کا ذریعہ اور ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ سمجھتا ہے یا یہ کہ وہ کسی ماوراء عقل یا ماوراء حواس ذریعہ علم (source of knowledge) کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ ہے؟ اگر آپ کی اس انقلابی کوشش کا آغاز یہاں سے نہیں ہوگا تو سمجھ لیجیے کہ آپ کی کوششیں بار آور نہیں ہوں گی۔ اگر ذہن پر مادہ پرستی‘ الحاد اور مختلف مشرکانہ اوہام کا تسلط ہے تو سب سے پہلے ان کی تطہیر لازم ٹھہرے گی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے جس ماحول میں وہ انقلاب برپا فرمایا اس میں تلاوتِ آیات کے ذریعے لوگوں کی ذہنی اور فکری تطہیر کے عمل کو مقدم رکھا۔ مادہ پرستی‘ الحاد اور مشرکانہ اوہام کے زہر سے قلوب و اذہان کو پاک کر کے مثبت طور پر دلوں میں ایمان باللہ‘ ایمان بالآخرت اور ایمان بالوحی اور رسالت کی بنیادیں قائم کیں۔ یہ ہے درحقیقت انقلابِ محمد ﷺ کا نقطہ آغاز۔ یہاں سے بات آگے چلتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے کہ دعوت و تبلیغ کے بارے میں جتنی اصطلاحات بھی وارد ہوئی ہیں ان سب کا مبنیٰ‘ ان سب کا مرکز اور محور قرآن مجید خود اپنے آپ کو قرار دیتا ہے۔ دعوت و تبلیغ کے ضمن میں ’’انذار و تبشیر‘‘ انبیاء کرام کا ایک بنیادی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ انذار کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِهٖ﴾ (الانعام: ۱۹) ’’مجھ پر یہ قرآن نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اس کے ذریعے سے خبردار کر دوں‘‘۔ معلوم ہوا کہ انذار کا اصل ذریعہ خود قرآن حکیم ہے۔ اسی طرح تبشیر کے بارے میں فرمایا: ﴿فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الۡمُتَّقِیۡنَ وَتُنۡذِرَ بِهٖ قَوۡمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾﴾ (مریم) ’’(اے نبیؐ!) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا ہے‘ تاکہ آپ اسی کے ذریعے اہل تقویٰ کو بشارت دیجیے اور اسی کے ذریعے آپ انذار فرمائیے اور خبردار کیجیے جھگڑالو قوم کو‘‘۔ گویا انذار ہو یا تبشیر دونوں کا ذریعہ اور مرکز و محور خود قرآن ہے۔

اسی طرح انبیاء کا ایک فریضہ ’’تذکیر‘‘ بھی ہے یعنی یاددہانی کرانا‘ نصیحت کرنا۔ سورۂ قٓ کی آخری آیت میں اس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿فَذَكِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مَنۡ یَّخَافُ وَعِیۡدِ ﴿۴۵﴾﴾ ’’تذکیر فرمائیے اس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہو‘‘۔ اسی طرح فرائض نبوت و رسالت کی تعبیر کے ضمن میں ایک اہم اصطلاح ’’تبلیغ‘‘ کی ہے۔ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ﴾ ’’(اے نبیؐ) پہنچا دیجیے تبلیغ فرمایئے اُس کی جو نازل کیا گیا آپ پر آپ کے رب کی طرف سے‘‘۔ الغرض دعوت و تبلیغ کے ضمن میں قرآن حکیم کی جو بھی بنیادی اصطلاحات ہیں مثلاً انذار و تبشیر اور تذکیر و تبلیغ‘ ان سب کا مرکز و محور خود قرآن ہے۔ چنانچہ سیرت مطہرہ میں بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ آپؐ نے ہر جگہ قرآن ہی کو پیش کیا‘ اپنی بات کہنے اور اپنی تقریر کرنے سے حتی الامکان احتراز فرمایا۔ بعض لوگوں نے خطباتِ نبویؐ کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی قلیل تعداد میں خطبات دستیاب ہو سکے ہیں۔ آپؐ کی گفتگو نہایت جامع اور مختصر ہوتی تھی اور جس جگہ بھی آپؐ دعوت پہنچانے کے لیے تشریف لے جاتے قرآنی آیات لوگوں کو پڑھ کر سناتے اور ان کے ذریعے انذار‘ تبشیر اور تذکیر فرمایا کرتے تھے کہ یہ ایک کلام ہے جو مجھ پر نازل ہوا ہے۔ یہ ایک پیغام ہے جس کو لے کر میں آیا ہوں۔ اسی قرآن کے ذریعے سے آپؐ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا۔ تو گویا انقلابِ محمدیؐ کا نقطۂ آغاز ہے تلاوتِ آیات اور اس کے ذریعے انذار و تبشیر‘ تذکیر و نصیحت اور دعوت و تبلیغ!

تزکیہ

﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ﴾ کے بعد اب آگے چلیے! ﴿وَیُزَکِّیۡهِمۡ﴾۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس کے بارے میں بدقسمتی سے ہمارے ہاں سب سے زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں

اور یہ خیال عام ہے کہ قرآن مجید نے شاید تزکیۂ نفس کا کوئی طریقہ ہمیں عطا نہیں فرمایا! بلاشبہ یہ بہت بڑا سوئے ظن ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کے طرزِ عمل سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سوئے ظن میں مبتلا ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے تزکیۂ نفس کا کوئی طریقہ ہمیں عطا نہیں فرمایا۔ میں پھر عرض کروں گا کہ یہ بہت بڑا سوئے ظن ہے قرآن حکیم سے بھی اور محمد رسول اللہ ﷺ سے بھی۔

تزکیے کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس مرحلے پر اسے اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ نوٹ کیجیے کہ تزکیہ کرنا انسان کا مطلوب ہے اور انسان مجموعہ ہے دو چیزوں کا۔ ایک ہے اس کی فکر اور اس کی سوچ اور دوسری چیز ہے اس کا عمل اور اس کی روش یا اس کا وہ طرزِ عمل جو وہ زندگی میں اختیار کرتا ہے۔ کچھ انسان ایسے ہوتے ہیں جن کے فکر و عمل میں بُعد یا تضاد پایا جاتا ہے۔ ایسے شخص کو آپ ایک مریض شخصیت قرار دیتے ہیں' اسے نارمل انسان نہیں قرار دیا جاتا' ورنہ ایک نارمل انسان کا ناقابلِ تقسیم اکائی (intergrated whoel) ہوتا ہے' اس کا عمل اور اس کا رویہ درحقیقت اس کے نظریات' اس کے افکار' اس کی سوچ اور اس کی فکر پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر سوچ غلط ہے' نقطۂ نظر غلط ہے' قلوب و اذہان پر اگر غلط نظریات و افکار کا تسلط ہے تو ظاہر بات ہے کہ عمل از خود غلط ہو جائے گا۔ عمل کو درست کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے سوچ کو درست کیجیے' نقطۂ نظر کی اصلاح کیجیے' فکر کو صحیح بنیادوں پر استوار کیجیے' اسے صحیح اساس پر reconstruct کیجیے اور تب توقع رکھیے کہ اس کا عمل درست ہوگا اور صحیح خطوط پر استوار ہوگا۔ قرآن مجید کا طریق تزکیہ یہ ہے۔ چنانچہ اس آیت میں تزکیے کا ذکر دراصل ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ کے نتیجے کے طور پر آیا ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کے ذریعے سے جب انسان کے فکر کی اصلاح ہوگئی' اس کے نظریات درست ہوگئے' الحاد و مشرکانہ اوہام کی جڑیں جب انسان کے ذہن اور اس کے قلب سے کٹ گئیں تو گویا اس طریقے سے غلط اعمال' غلط کردار اور غلط عادات کی جڑ بھی کٹ گئی۔ اس لیے کہ ان کے لیے اب غذا مہیا نہیں ہو رہی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ غلط اعمال بالکل اس طرح سے انسانی سیرت سے علیحدہ ہو جائیں گے جس طرح سے پت جھڑ کے موسم میں پتے درختوں سے گر جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے تزکیۂ نفس کے ضمن میں ہمارے صوفیاء نے جو مختلف طریقے اختیار کیے ہیں وہ طریقِ نبویؐ سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں رکھتے۔ ہماری ایک بڑی بدقسمتی یہ بھی رہی ہے کہ دورِ صحابہؓ کے بعد ہمارے ہاں اس وحدتِ فکر و عمل میں بتدریج زوال آتا چلا گیا جو دورِ خلافتِ راشدہ کا طرۂ امتیاز تھا۔ کچھ لوگ قانون اور فقہ کے ماہر بن گئے اور کچھ نے تزکیۂ نفس کے میدان کو اختیار کر لیا۔ اس طریقے سے مختلف گوشوں میں یہ تمام امور بڑھتے چلے گئے اور ہر گوشہ اپنے ہی انداز میں ترقی کرتا اور پروان چڑھتا رہا۔ اس طرح وہ وحدتِ فکر و عمل جو قرآن مجید نے عطا کی تھی' مجروح ہوئی۔ چنانچہ تزکیۂ نفس کے معاملے میں نمعلوم کہاں سے یہ نظریات لیے گئے اور کہاں سے یہ نفسیاتی ریاضتیں اور مشقتیں اخذ کی گئیں کہ جن کے ذریعے سے تصفیۂ باطن' تزکیۂ نفس اور تربیتِ روحانی کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ میں گہرے احساس کے ساتھ اور علیٰ وجہ البصیرت یہ عرض کر رہا ہوں کہ اس میدان میں طریقِ نبویؐ سے کچھ زیادہ ہی دور ہوتی چلی گئی۔ نبی اکرم ﷺ کا طریقۂ تربیت اور اسلوبِ تزکیہ اس سے بہت مختلف تھا۔

نبی اکرم ﷺ نے تزکیۂ نفس کے لیے جو طریقہ اختیار فرمایا تھا وہ یہی تھا کہ پہلے اس قرآن کے ذریعے سے فکر کی تطہیر کی جائے' نقطۂ نظر اور سوچ کی اصلاح کی جائے' نتیجتاً غلط اعمال پت جھڑ کے پتوں کی طرح از خود جھڑ جائیں گے یا جیسے اس درخت کے پتے سوکھ کر جھڑ جاتے ہیں جس کی جڑ کاٹ دی گئی ہو۔ یہ ہے تزکیہ کا عمل اور جان لیجیے کہ قرآن مجید ہی درحقیقت اس عمل تزکیہ کا بھی محور ہے۔ ''تلاوتِ آیات'' کی طرح تزکیے کی اساس اور بنیاد بھی یہی قرآن ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس معاملے میں جو طریقے اختیار کیے گئے ان میں بالعموم قرآن حکیم کو نظر انداز کر دیا گیا۔ علامہ اقبال نے اس تلخ حقیقت کی جانب اپنے ان اشعار میں بڑی خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے: ؎

صوفی پشمینہ پوشِ حال مست
از شراب نغمہ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

کہ اس عمل تزکیہ کا سارا تعلق قرآن حکیم سے تو کٹتا چلا گیا اور صوفیوں کا حال بالعموم یہ ہو گیا کہ عراقی یا اس قبیل کے دیگر شعراء کے اشعار سے تو ان کے دلوں میں حرارت پیدا ہوتی ہے لیکن قرآن کو سن کر اُن کی آنکھیں پرنم نہیں ہوتیں۔ اس لیے کہ تلاوتِ قرآن کے ذریعے سے اندرونی کثافتوں اور کدورتوں کی صفائی کا جو طریقہ تھا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا‘ وہ متروک ہوتا چلا گیا اور تزکیہ کا عمل جو درحقیقت براہِ راست نتیجہ تھا ﴿یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ﴾ کا اسے اس کی اصل سے کاٹ دیا گیا۔ علامہ اقبال نے بعض حقائق کی تعبیر بڑی خوبصورتی سے کی ہے اور اس اعتبار سے میری گفتگو میں اُن کا بار بار حوالہ آ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زاں کہ اُو گم اندر اعماقِ دل است

کہ ابلیس کو قتل کر دینا اور اس کو بالکل ختم کر دینا بڑا مشکل کام ہے‘ اس لیے کہ وہ تو لوگوں کے وجود کے اندر سرایت کر جاتا ہے‘ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ یہ درحقیقت اس حدیثِ نبویؐ کا ترجمہ یا ترجمانی ہے کہ جس میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ)) (۱)

”بے شک شیطان تو انسان کے وجود کے اندر اس طرح جاری و ساری ہو جاتا ہے جیسے (اس کی رگوں میں) خون دوڑتا ہے“۔

اس کے بعد علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی

(۱)

کشتہ شمشیر قرآنش کنی

اس شعر کے پہلے مصرعے میں بھی درحقیقت ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے۔ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ اس پر صحابہؓ میں سے واقعتاً کسی نے بڑی ہمت کر کے سوال کیا کہ حضور! کیا آپؐ کے ساتھ بھی شیطان ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں ہے‘ لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی حدیث کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ ع

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی

یعنی بہتر یہ ہے کہ تم اس شیطان کو مسلمان کر لو! لیکن اس کا طریقہ کیا ہے؟ وہ یہ کہ ع

کشتہ شمشیر قرآنش کنی!

اسے قرآن کی شمشیر سے قتل کرو۔ تمہارے اندر یہ غلط خیالات‘ غلط رجحانات‘ غلط جذبات اور غلط شہوات پیدا ہو رہی ہیں تو یہ درحقیقت تمہاری غلط سوچ و فکر اور تمہارے نقطۂ نظر کے کج ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ یہ قرآن ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمہاری سوچ کو صحیح کرے گا‘ تمہارے نقطۂ نظر کو درست کرے گا‘ اور تمہارے نظامِ اقدار (Value System) کو صحیح بنیادوں پر استوار کرے گا۔ یہ ہے وہ طریقہ کہ جس سے تمہاری شخصیت میں انقلاب آئے گا اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ غلط عادات اور غلط افکار کے دھبے تمہاری شخصیت سے خود بخود دور ہوتے چلے جائیں گے اور باطن کے اس انقلاب کے بعد ہی تم اس قابل ہو سکو گے کہ خارج میں بھی انقلاب برپا کر سکو!

میں یہاں پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کے اس انقلابی عمل میں قرآن حکیم کو جو اہمیت حاصل ہے اور جس کو بڑے ہی اجمال کے ساتھ مولانا حالی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

(۱)

واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں اس حقیقت کو علامہ اقبال مرحوم نے کما حقہٗ سمجھا ہے اور اس کا ادراک کیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی عظمت کا بیان جس طرح ہمیں ان کے ہاں ملتا ہے' وہ اس دَور کے کسی اور شخص کے ہاں نہیں ملتا۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن
آن کتابِ زندہ قرآن حکیم
حکمت اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثل حق پنہاں و ہم پیداست اُو
زندہ و پایندہ و گویاست اُو
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

ان اشعار میں سے آخری شعر میں علامہ اقبال نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ جب یہ قرآن کسی کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے' اس کے اندر ایک عظیم انقلاب آ جاتا ہے' اس کی سوچ' اس کا فکر اور اس کے نظریات بدل جاتے ہیں' اس کی اقدار' اس کا نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب گویا کہ وہ مکمل طور پر ایک بدلا ہوا انسان ہے اور اس کے اندر سے جو یہ تبدیلی ابھری ہے' یہی درحقیقت صحیح طور پر خارج میں ایک تبدیلی برپا کر دے گی اور اس طرح تمام غلط رویے اور تمام غلط اعمال خود بخود دھوتے چلے جائیں گے' کیونکہ اندر سے ان کو غذا دینے والی جڑیں اب کاٹی جا چکی ہیں۔

تعلیم کتاب

تلاوتِ آیات اور تزکیۂ نفوس کے بعد تیسرا مرحلہ ''تعلیمِ کتاب'' کا ہے۔ چنانچہ آگے فرمایا:

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾

''اور وہ تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب کی''۔

یہاں ایک بات نوٹ کر لینی چاہیے کہ جیسا کہ آغاز میں عرض کیا جا چکا ہے ''تلاوتِ آیات'' میں بھی پیشِ نظر قرآن ہے۔ لیکن یہاں پھر جو کتاب کا لفظ آیا ہے تو اس میں یقیناً قرآن مجید کا کوئی دوسرا پہلو پیش نظر ہے۔ اس طرح مختلف الفاظ سے قرآن مجید ہی کے مختلف گوشوں یا مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید میں لفظ ''کتاب'' بالعموم قانون کے لیے آتا ہے' مثلاً کسی چیز کے وجوب اور فرضیت کا بیان ''کُتِبَ'' کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جیسا فرمایا گیا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ ''تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا''۔ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ ''تم پر قتال فرض کر دیا گیا''۔ ایسے ہی وصیت کے وجوب کے بارے میں جو ابتدائی حکم تھا اس کے الفاظ ہیں: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ......﴾ ''تم پر واجب کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آ موجود ہو اور اگر وہ کچھ مال چھوڑ کر جا رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے وصیت کر جائے!'' کہیں آتا ہے: ﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ......﴾ ''یہاں تک کہ قانون اپنی اصل مدت کو پہنچ جائے''۔ تو لفظ ''کتاب'' کا اطلاق اس کی پوری ہمہ گیریت کے ساتھ پورے قرآن مجید پر بھی ہوگا۔ لیکن جب قرآن کے مختلف پہلوؤں کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے جا رہے ہوں تو ''کتاب'' سے مراد قوانین اور احکام ہوں گے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کی وضاحت کے لیے مختلف الفاظ آ رہے ہیں۔

(۱)

سب سے پہلے فرمایا: ﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ﴾ اور یہاں ''تلاوتِ آیات'' سے مراد لازمی طور پر قرآن حکیم ہی کی آیات کی تلاوت ہے۔ اس کے بعد ﴿یُزَکِّیۡهِمۡ﴾ کے الفاظ میں تزکیۂ نفوس کا ذکر کیا گیا جو اسی کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ پھر ﴿یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ﴾ میں جو لفظ ''کتاب'' دوبارہ آیا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ یہاں اس سے مراد احکامِ شریعت (DOs & DON'Ts) ہیں، یعنی یہ کرو اور یہ نہ کرو! یہ حلال ہے اور یہ حرام!

احکامِ شریعت میں حکمتِ تدریج

حلال وحرام کے احکام دینے میں یہ تدریج اور ترتیب برقرار رکھی گئی ہے کہ انہیں قلوب واذہان کو بدلے بغیر نافذ نہیں کیا گیا۔ جب ذہن وفکر کی تبدیلی عمل میں آ چکی، دلوں کی دنیا میں ایمان جاگزیں اور راسخ ہو چکا اور بنیادی طور پر برے کردار اور برے اخلاق سے انسان کا دامن صاف ہو چکا تو اب یوں سمجھئے کہ گویا زمین میں ہل چل چکا ہے اور وہ بیج ڈالے جانے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اب بیج ڈالیں گے تو وہ بیج بارآور ہوگا، نتیجہ خیز ہوگا۔ زمین کو تیار کیے بغیر بیج ڈال دیا جائے تو بیج ضائع ہو جائے گا۔ چنانچہ جب ﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ﴾ کا عمل کیا جا چکا اور تزکیے کے بنیادی تقاضے پورے ہو چکے، تب کہا گیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو! اور اس وقت ہر حکم کو پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کیا گیا۔ غور کیجیے کہ قرآن میں پہلے ہی حلال اور حرام کے احکام کیوں نہیں آ گئے اور ان کا نزول اتنی دیر کے بعد کیوں ہوا؟ یا پورا قرآن یک دم کیوں نازل نہیں کر دیا گیا؟ اس کی وجہ یہی حکمتِ تدریج ہے۔ پہلے وہ آیات اور سورتیں اُتریں جنہوں نے قلوب واذہان کی دنیا میں ہل چلایا اور اس میں سے کثافتوں کو نکال کر باہر پھینک دیا، ایمان کی بنیادوں کو استوار کیا، نتیجتاً بنیادی انسانی اخلاق پروان چڑھے اور گندگیوں سے سیرتیں پاک ہوگئیں۔ اس طرح جب یہ زمین پوری طرح تیار ہوگئی تو اس میں بیج ڈالا گیا اور یہ بیج خوب بارآور ہوا۔ یہ ہے وہ حکمت اور تدریج کہ جو قرآن مجید نے اپنے نزول میں ملحوظ رکھی، یا صحیح تر الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ قرآن کے نازل

(۱)

کرنے والے نے اس کے نازل کرنے میں پیشِ نظر رکھی اور اسی حکمت اور اسی تدریج کے ساتھ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے انقلاب برپا کیا۔

یہ اسی کا مظہر ہے کہ ذہنی وقلبی تربیت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو بھی حکم دیا گیا وہ انہوں نے بلاتامل قبول کیا۔ انہیں جس چیز کے چھوڑنے کو کہا گیا وہ انہوں نے فوراً ترک کر دی۔ غور کیجیے کہ شراب جیسی چیز جسے طبی دنیا میں بھی ''habit making'' مانا جاتا ہے اور جو انسان کے پورے جسمانی نظام کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جاتی ہے کہ پھر اس کا دفعتاً چھوڑ دینا نقصان دہ ہوسکتا ہے، جب اس کی حرمت کا حکم آتا ہے تو قرآن مجید اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا اعجاز دیکھئے کہ شراب کا جام اگر کسی کے ہونٹوں تک بھی پہنچا ہوا تھا تو اس کا ایک گھونٹ اس کے اندر نہیں گیا۔ شراب کی حرمت کے اعلان کے ساتھ ہی اس کے تمام برتن توڑ ڈالے گئے اور مدینے کی گلیوں میں شراب کی ندیاں بہہ نکلیں۔ حالانکہ یہ وہ لوگ تھے کہ جن کی گھٹی میں شراب تھی، جن کے ہاں شراب کا بالکل وہی تصور تھا جو آج آپ کو مغربی تہذیب میں نظر آتا ہے کہ پانی تو پانی ہے، لیکن پینے کی اصل شے شراب ہے۔ شراب ان کی تمدنی زندگی کا جزو لاینفک تھی، شراب پیتے ہوئے ان کی ساری ساری عمریں بیت گئی تھیں، شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی، لیکن جب شراب کی حرمت کا حکم آ گیا تو انہوں نے اس کو کسی توقف کے بغیر چھوڑ دیا، اور اس شان کے ساتھ چھوڑا کہ پھر پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ یہ درحقیقت محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا ایک معجزہ ہے اور اس معجزے کی بنیاد یہی تدریج اور حکمت ہے۔

احکام کی تنفیذ سے پہلے ان کے دلوں میں ایمان راسخ ہو چکا تھا۔ یہ یقین پیدا ہو چکا تھا کہ محمد (ﷺ) جو کچھ کہہ رہے ہیں اپنی طرف سے نہیں، اللہ کی طرف سے کہہ رہے ہیں ﴿وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی ﴿۳﴾ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ﴿۴﴾﴾ انہیں اللہ کی ذات اور آخرت پر یہ پختہ یقین حاصل ہو چکا تھا کہ مرنے کے بعد اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے، جہاں تمام اعمال کی جواب دہی ہوگی اور یہ کہ اصل زندگی آخرت کی ابدی زندگی

(۱)

ہے۔ جب یہ یقین پیدا ہو چکا تو اب کسی لمبے چوڑے استدلال کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ جب سود کی حرمت کا حکم آیا تو اس کے لیے کسی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں پڑی۔ تجارت کے ساتھ اس کی ظاہری مشابہت کی بناء پر اگر یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ ﴿اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ تو جواب صرف یہ دیا گیا: ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ کہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے۔ تو جو کوئی اللہ کو مانتا ہوا اور یہ ایمان رکھتا ہو کہ محمد (ﷺ) یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے' اللہ کی طرف سے کہہ رہے ہیں' تو اب اس کے لیے چون و چرا کی کوئی گنجائش نہیں۔

اس کے برعکس امریکہ میں بڑے ٹھوس اعداد و شمار کی بنیاد پر شراب پر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ شراب نوشی کے نقصانات گنوائے گئے' بتایا گیا کہ ٹریفک کے حادثات اکثر و بیشتر شراب نوشی کی وجہ سے ہوتے ہیں' کئی بار ایسا ہو چکا ہے کہ کسی ذمہ داری افسر کو شراب کے نشے میں مست کر کے جاسوس حسینائیں اس سے قومی اہمیت کے بڑے بڑے راز اگلوا کر لے گئیں۔ لیکن اس طرح کے متعدد حقائق بیان کرنے اور پورے اعداد و شمار مہیا کرنے کے بعد بھی جب اس پر پابندی عائد کی گئی تو یہ سارے اعداد و شمار' یہ سارا فلسفہ اور سارے طبی اور سائنسی حقائق دھرے کے دھرے رہ گئے اور ع ''چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' کے مصداق پابندی کا یہ حکم قبول نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ حکم واپس لینا پڑا اور شراب کی حلت کو پھر سے تسلیم کرنا پڑا۔ لیکن محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا اس کے process میں ہمیں ایک تدریج نظر آتی ہے۔ چنانچہ پہلے کتابِ الٰہی کی تلاوت آیات اور پھر اسی کے ذریعے سے تزکیۂ نفوس کے بعد تعلیم کتاب یعنی احکامِ شریعت کی تعلیم اور تنفیذ کا مرحلہ آتا ہے۔ اس مرحلے پر اب اوامر و نواہی' حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی پوری فہرست دے دی گئی اور اس کی تنفیذ بھی ہو گئی۔

تعلیم حکمت

انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کا آخری مرحلہ ''تعلیمِ حکمت'' کا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ''حکمت'' کا لفظ اس سے پہلے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ضمن میں آیا تھا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾ اُس مقام پر لفظ ''حکمت'' پر گفتگو کی گئی تھی اور عرض کیا گیا تھا کہ عربی میں ''ح ک م'' کا مادی بنیادی طور پر کسی شے کی پختگی اور استحکام کے لیے آتا ہے۔ حکمت انسانی عقل اور شعور کی پختگی ہے۔ انسان کے اندر غور و فکر کی جو استعداد ہے اس کا پختہ (mature) ہو جانا اور اس میں اصابت رائے کی صلاحیت کا پیدا ہو جانا حکمت ہے اور یہ انسان کی صلاحیتوں میں بلند ترین چیز ہے۔ عام تعلیمی نظام میں بھی تربیت انسانی کے نقطۂ نظر سے یہ تدریج ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ کسی بچے کو آپ پہلے تاریخ کے واقعات کا مطالعہ کروائیں گے اور اس کو یاد کروائیں گے کہ فلاں فلاں واقعات کب اور کیسے ہوئے۔ اس کے بعد پھر ایک مرحلہ ''فلسفۂ تاریخ'' کا آتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ فلاں قوم کو شکست کیوں ہوئی' فلاں تہذیب کو عروج کیوں حاصل ہوا اور فلاں تمدن زوال پذیر کیوں ہوا؟ وغیرہ۔ اسی طرح آپ جغرافیہ میں پہلے یہ پڑھائیں گے کہ فلاں ملک کی آب و ہوا کیا ہے' وہاں کی زرعی پیداوار کیا ہے اور وہاں کون کون سے معدنی ذخائر پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد پھر طبیعی جغرافیہ (Physical Geography) میں یہ مرحلہ بھی آتا ہے کہ یہ تغیر و تبدل کیوں ہے؟ یہ موسم اس طرح کیوں بدلتے ہیں؟ فلاں جگہ یہ چیز کیوں پیدا ہو رہی ہے؟ اور فلاں خطے میں یہ معدنیات کیوں پائی جاتی ہیں؟ تو درحقیقت یہ ''کیوں اور کیسے؟'' ہر گوشۂ علم میں چوٹی کی چیز ہے۔ اسی طریقے سے دینے کا معاملہ ہے۔ انسانی ذہن اور شعور تربیت پا کر وہ پختگی حاصل کر لیں کہ انسان دین کے ''کیوں اور کیسے'' کو سمجھ سکے تو یہ ''حکمت'' ہے۔ فاتح دورِ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغه'' کا موضوع یہی حکمت دین ہے کہ احکامِ شریعت میں کیا حکمتیں ہیں' ان کے کیا مقاصد ہیں؟

دین پر عمل کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ ہر مسلمان کو شریعت کا اوامر و نواہی کی پابندی کرنی ہے۔ ''سمع و طاعت'' اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔

Theirs not to reason why?
Theirs but to do die!

لیکن اس سے بلند تر سطح یہ ہے کہ وہ بصیرتِ باطنی اور enlightment پیدا ہو جائے کہ جس سے نظر آنے لگے کہ یہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے‘ اس کی حکمتیں کیا ہیں‘ اس کی غرض کیا ہے‘ اس کی علت کیا ہے‘ اس کی مصلحتیں کیا ہیں! انسان کے اپنے مفاد میں اور نظام اجتماعی کے اپنے مصالح کے اعتبار سے دین کے ان احکام کی کیا اہمیت اور کیا مقام و مرتبہ ہے!! اس مرحلے پر پہنچ کر حکم بوجھ محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک نعمت معلوم ہونے لگتا ہے۔ تب شریعت کے اوامر و نواہی طبیعت کے لیے کسی ناگوار کیفیت کے حامل نہیں رہ جاتے‘ بلکہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے انعام و احسان ہونے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں شریعت کو نعمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ ......﴾ یعنی یہ اللہ کا انعام ہے کہ اُس نے تمہیں تمام پیچیدہ اور پر پیچ راہوں میں ایک درمیانی راہ ’’صراطِ مستقیم‘‘ عطا فرما دی اور ایک متوازن اور معتدل نظام تمہیں عطا فرمایا۔ یہ سراسر انعامِ خداوندی ہے اور اس نعمت کا اتمام ہوا ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر۔ سورۃ البقرۃ میں اس ’’حکمت‘‘ کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ط﴾ کہ جس کو حکمت عطا کر دی گئی اسے تو خیر کثیر سے نواز دیا گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ حکمت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی دولت ہے اور اللہ کا اُس شخص پر بہت ہی بڑا احسان ہے جسے اُس نے حکمت سے نوازا ہو۔ علامہ اقبال نے اسے ’’اِسرارِ دین‘‘ سے تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

اے کہ می نازی بہ قرآنِ حکیم
تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن!
نکتہ شرعِ مبیں را فاش کن!

تو حکمت دین کی تعلیم اور اس کا عام کیا جانا انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج میں چوٹی کا معاملہ ہے۔ گویا یہ اس کا مرتبۂ کمال اور نقطۂ عروج ہے۔

فرد اور معاشرے میں انقلاب کا لائحۂ عمل

اب آپ ان چاروں اصطلاحات کو ایک مرتبہ پھر اپنے ذہن کے سامنے لائیے: (۱) یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ (۲) وَیُزَکِّیْھِمْ (۳) وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ (۴) وَالْحِکْمَۃَ — اور دیکھئے کہ انقلاب کے عمل میں ان کو بتدریج کیسے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کا کوئی عزیز‘ کوئی نوجوان ہے جو آپ کو محبوب ہے اور آپ پورے خلوص کے ساتھ چاہتے ہیں کہ وہ دین کی طرف آئے‘ یا یوں تعبیر کیجیے کہ اس میں دینی انقلاب برپا ہو جائے۔ اس کی کچھ عادات اور دلچسپیاں ایسی ہیں کہ جو آپ کی نظر میں کھٹکتی ہیں‘ اس کے صبح و شام کا رنگ کچھ بدل گیا ہے۔ آپ اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے فکر اور ذہن کا جائزہ لیجیے کہ کہیں اس کے ذہن میں کوئی ’’برٹینڈ رسل‘‘ تو نہیں ہے‘ وہاں کوئی ’’ساخت‘‘ اور اس کا فلسفہ موجودیت تو مسلط نہیں ہے‘ کہیں کسی ’’فرائیڈ‘‘ کے نظریات نے تو اس پر تسلط حاصل نہیں کر لیا‘ کہیں کسی اور کا نظریہ تو نہیں ہے کہ جو اس کے ذہن اور دل میں مستولی ہو گیا ہو۔ اگر آپ یہ تجزیہ نہیں کر سکتے اور اس کا مداوا نہیں کر سکتے‘ آیاتِ قرآنیہ کے ذریعے سے اس کے دل میں نورِ ایمان‘ اللہ کا یقین‘ آخرت کا یقین‘ جنت و دوزخ کا یقین اور وحی اور رسالت کا یقین پیدا نہیں کر سکتے‘ تو جان لیجیے کہ آپ کی وہ ساری خواہش دھری رہ جائے گی اور اس کے اندر کوئی تبدیلی برپا نہ ہو سکے گی۔ وہ اگر سعادت مند ہے تو آپ کے سامنے چپ ہو جائے گا‘ گردن جھکا دے گا۔ ہو سکتا ہے آپ کے دباؤ کے تحت‘ جہاں آپ کے سامنے ہو‘ نماز بھی پڑھ لے‘ لیکن اس کی فکر کچھ اور ہے‘ اس کی سوچ کچھ اور ہے ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ!

اس کی فکر اور اس کی سوچ پر تو کچھ اور چیزوں کا تسلط ہو چکا ہے‘ جن میں کہیں نماز یا روزے کی گنجائش ہی نہیں۔

اوامر ونواہی اور حلال وحرام کی بنیاد یہ ہے کہ کوئی صاحبِ ایمان ہو' وہ وحی و رسالت اور کتاب کو مانتا ہو' اگر وہ بنیاد ہی موجود نہ ہو تو کیا حلال اور کیا حرام؟ اس کے ذہن میں کس چیز کے بارے میں فرض کا تصور قائم ہوگا اور کس چیز کو وہ ممنوع اور حرام سمجھے گا؟ یہ ساری چیزیں اس وقت تک بے بنیاد ہیں جب تک ایمان دل کے اندر پیدا نہ ہو جائے۔ یہی ایک واحد راہِ عمل ہے کسی شخص کو بدلنے کی۔ اور یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ اس سارے عمل کا مرکز ومحور قرآن حکیم ہے۔ اگر ''تلاوتِ آیات'' کے ذریعے اس میں ذہن وفکر کی تبدیلی آتی ہے تو اس کی بری عادتیں خود بخود بدل جائیں گی اور سب بری لتوں سے وہ خود بخود آزاد ہوتا چلا جائے گا اور اب آپ کو ایک ایک چیز کے لیے علیحدہ علیحدہ دردِ سر مول لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جب وہ جڑیں کٹ جائیں گی جن سے ان عاداتِ فاسدہ کے پتوں کو فاسد غذا باہم پہنچ رہی تھی تو وہ خود بخود خشک ہو کر گر پڑیں گے۔ اب وہ وقت آئے گا کہ آپ اسے بتائیں کہ یہ ہے دین کا حکم' اور وہ اس پر عمل پیرا ہو جائے گا۔ اور یہ عمل مصنوعی نہیں ہوگا' بلکہ فطری ہوگا۔ اس کے بعد اگر اس میں استعداد ہے تو اسے مرتبۂ حکمت تک پہنچائیے۔ یہاں پہنچ کر اس کی شخصیت کو دین کے بارے میں ٹھہراؤ' تمکن اور دوام حاصل ہوگا۔ اس کے کیا ہی کہنے ہیں! ظاہر بات ہے کہ حکمت کا یہ مقام کچھ نرالا ہی مقام ہے۔ یہاں انسان گویا کہ اپنی بصیرتِ باطنی سے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ حق یہی ہے۔ یہ اس کا ذاتی تجربہ بن جاتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ دین میں کیا مقدم ہے' کیا مؤخر ہے۔ کس چیز کی حیثیت جڑ کی ہے اور کس کی فرع کی۔ اب وہ اندھے کی طرح ٹامک ٹوئیے نہیں مار رہا ہوتا' بلکہ وہ دین کی تمام اقدار کو ان کے صحیح مقام پر صحیح توازن واعتدال کے ساتھ برقرار رکھتا ہے۔ یہ ہے مرتبۂ حکمت' کہ جس کو عطا ہو گیا اسے خیر کثیر عطا ہو گئی۔

اب یہاں ایک اور بات سمجھ لیجیے تو یہ مضمون مکمل ہو جائے گا۔ جس طرح کا معاملہ ایک فرد نوعِ بشر کا ہے بالکل اسی طرح ایک قوم یا اجتماعیت کے تحت زندگی بسر کرنے والے ایک مجموعۂ افراد کا ہے۔ ایک ہیئت اجتماعیہ سے منسلک ہونے والے افراد بھی مجموعی طور پر ایک فرد (individual) ہی کی طرح کا رویہ رکھتے ہیں۔ اور جس طرح ایک فرد کے وجود میں دماغ قوتِ فیصلہ کا حامل ہوتا ہے اور پورے وجود پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح ایک ہیئت اجتماعیہ میں ایک ''ذہین اقلیت'' اس پورے مجموعۂ افراد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دماغ میں پکڑنے کی طاقت نہیں ہے' یہ طاقت ہاتھ میں ہے' لیکن پکڑنے کا حکم اسے دماغ سے ملتا ہے۔ ہاتھ کیا پکڑے اور کیا نہ پکڑے' اس کا فیصلہ بھی دماغ کرتا ہے۔ اسی طرح پاؤں چل سکتے ہیں' لیکن چلیں نہ چلیں' اور اگر چلیں تو کدھر جائیں کدھر نہ جائیں' اس کا فیصلہ دماغ کرے گا۔ نوعِ انسانی کے ایک فرد میں ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء و جوارح ہیں' لیکن ان سب کو دماغ کنٹرول کر رہا ہوتا ہے۔ گویا کہ انسان کے دو ڈھائی من کے وجود میں پاؤ ڈیڑھ پاؤ کے دماغ کو ایک حکمران کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ بالکل اسی طریقے سے جان لیجیے کہ کسی قوم' کسی معاشرے' کسی سوسائٹی' کسی کمیونٹی یا کسی ہیئت اجتماعیہ میں جو ایک ذہین اقلیت (intellectual minority) یا intelligentsia ہوتی ہے' جسے آپ brain trust سے تعبیر کر سکتے ہیں' اس پوری ہیئت اجتماعیہ کو کنٹرول کر رہا ہوتا ہے۔ اس طبقہ کے لوگ اگرچہ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں' لیکن یہ اپنے معاشرے' اپنی قوم اور اپنے ملک میں بالکل اسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کہ جو اہمیت ایک فردِ بشر میں اس کے اپنے دماغ کو حاصل ہے۔ یہ سوچتے ہیں اور معاشرے کے رخ کا تعین کرتے ہیں۔ باقی عوام الناس اعضاء و جوارح کی مانند ہیں۔ جدھر یہ رخ کر لیں گے پورا معاشرہ اُدھر رخ کر لے گا' بالکل اسی طرح جیسے دماغ کے فیصلے کے تحت پاؤں چلتے اور ہاتھ حرکت کرتے ہیں۔

آپ کسی بھی معاشرے میں تبدیلی برپا کرنا چاہتے ہیں' کسی قوم یا ہیئت اجتماعیہ کو اسلام کے حق میں بدلنا چاہتے ہیں یا یوں کہیے کہ کسی جگہ پر بھی آپ اسلامی انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے نبی اکرم ﷺ کے طریق انقلاب پر اساسی منہاج یہی

---

(۱)

ہو گا کہ پہلے اس ذہین اقلیت کو تبدیل کیجیے۔ اگر اس کو آپ اسلام کے حق میں convert کر لیں اور اس میں ایمان و یقین کی روشنی پیدا ہو جائے تو اس طرح اس حلقے اور طبقے میں ایک ایسا مضبوط نیوکلیس پیدا ہو جائے گا جس نے دین کی بنیادی اقدار کو علی وجہ البصیرت قبول کیا ہو گا' نہ کہ محض اعتقادی طور پر صرف ایک ''dogma'' کی حیثیت سے۔ چنانچہ اس ذہین اقلیت اور brain trust کے تبدیلی قبول کرنے سے مجموعی طور پر پورا معاشرہ تبدیلی قبول کر لے گا۔ ورنہ آپ عوام میں وعظ ونصیحت کرتے رہیے تو اگرچہ اس سے عوام الناس کے اندر ایک رجوع عام بھی ہو جائے' تبدیلی برپا نہیں ہو گی۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے اس چھوٹی سی مثال پر غور کر لیجیے کہ ہمارے ہاں کسی زمانے میں ترقی پسند ادیبوں نے بعض اصطلاحات کا استعمال شروع کیا اور آج وہ اصطلاحات ہمارے معاشرے کے نچلے طبقات تک پہنچ گئی ہیں۔ ''استحصال'' جیسا بھاری بھرکم لفظ آج کسی تانگے بان اور کسی ریڑھی چلانے والے کی زبان پر آپ کے سننے میں آئے گا' اس لیے کہ یہ عمل ان لوگوں سے چلا تھا جو اس ملک کے اندر غور وفکر کرنے والے اور سوچ بچار کرنے والے لوگ تھے۔ اس ''ذہین اقلیت'' نے ایک فلسفے کو قبول کیا تھا اور پھر وہ فلسفہ اس معاشرے کے اندر سرایت کرتا چلا گیا۔ آپ کسی پارٹی کو تو ban کر سکتے ہیں' لیکن فکر پر کوئی قدغنیں عائد نہیں کی جا سکتیں' فکر کے لیے کسی پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود بخود پھیلتا ہے اور کسی ملک یا کسی معاشرے میں اس کو قید و بند میں ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ اس وقت کی دنیا میں جبکہ فاصلے معدوم ہو گئے ہیں آپ کسی ملک یا خطۂ زمین کو محفوظ خطہ بنا کر نہیں رکھ سکتے کہ یہ فکر وہاں نہ آنے پائے۔ اصل معاملہ فکر ہی کا ہے۔ اگر فکر بدلے گا' سوچ بدلے گی' تو انسان بدلے گا۔ انسان کی انفرادی تبدیلی کے لیے بھی فکر کی تبدیلی لازمی ہے اور کسی معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کے لیے بھی فکر کی تبدیلی ناگزیر ہے۔ اسلامی انقلاب کے لیے فکری بنیاد بھی قرآن حکیم سے مہیا ہوتی ہے اور اس کا پورا اساسی منہاج بھی قرآن حکیم ہی پر مبنی ہے: ﴿یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ﴾

چوں بجا در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اس ضمن میں بعض لوگوں کو مغالطہ اور اشتباہ لاحق ہو سکتا ہے کہ کیا اتنا عظیم انقلاب اور اتنی بڑی تبدیلی صرف ایک کتاب کے بل پر پیدا ہو جائے گی؟ میں انہیں دعوت دوں گا کہ ذرا نگاہ دوڑائیے' اس وقت اشتراکی نظام روئے ارضی کے کتنے بڑے حصے پر قائم ہے۔ پورے مشرقی یورپ' پورے شمالی ایشیا' بلکہ چین سمیت ایشیا کے اکثر و بیشتر حصے کے علاوہ دنیا کے کئی دور دراز ممالک میں یہ جو نظام قائم ہے اس کا سراغ لگائیے کہ یہ کس کا نتیجہ ہے؟ یہ سب کارل مارکس کی کتاب داس کیپٹل (Das Capital) اور اس کے فلسفے کا اثر ہے کہ ذہنوں نے جس کو قبول کیا اور ان پر اس کی چھاپ قائم ہوئی۔ اور یہ انقلابات درحقیقت اسی کی بنیاد پر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے مارکس کے بارے میں کہا تھا ع

''نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب''

اس کی بغل میں ''کتاب'' تھی' اور یہ بات کسی کو پسند ہو یا ناپسند ہو' کوئی اسے غلط سمجھے یا صحیح' لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ سارے انقلابات درحقیقت اسی کتاب کا ایک ظہور اور اسی کتاب کا ایک بروز ہیں۔ تو ذرا سوچیے کہ ایک انسان کی کاوش' اس کی تصنیف کردہ ایک کتاب اگر دنیا میں اتنے وسیع وعریض پیمانے پر اتنے وسیع وعریض خطے میں انقلاب برپا کر سکتی ہے تو کیا کتاب اللہ دنیا میں انقلاب برپا نہیں کر سکتی؟ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کتاب کی طرف approach درست ہو' اس کتاب کو اس کا صحیح مقام دیا گیا ہو' اس کتاب سے واقعتاً وہ کام لیا جائے کہ جس کے لیے وہ نازل کی گئی ہے' جس کے لیے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شان میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ﴾ جس کے ذریعے سے افراد

بدلے' ان کے اندر انقلاب آیا اور پھر انہوں نے ساری انقلابی جدوجہد سے گزر کر انقلابِ محمدﷺ کی عملی تکمیل فرمادی۔

سورۃ الجمعہ کا عمود معین ہو جانے کے بعد اور اس کی مرکزی آیت کے مفہوم و معنی کو کسی حد تک سمجھ لینے کے بعد اب آیئے کہ اس کا آغاز سے تسلسل کے ساتھ مطالعہ شروع کریں۔ ہمیں اس کی ایک ایک آیت پر بھی اجمالاً غور کرنا ہے اور خاص طور پر ہر آیت کا اس سورۃ کے عمود اور مرکزی مضمون کے ساتھ جو ربط بنتا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش بھی نا کام ہوتی ہے۔

پرجلال آغازِ کلام

فرمایا:

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ①﴾

''تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے' (اس اللہ کی) جو الملک (یعنی بادشاہ) ہے' القدوس (یعنی پاک) ہے' العزیز (یعنی زبردست) ہے' الحکیم (یعنی کمال حکمت والا) ہے''۔

یہ پہلی آیت گویا اس سورۂ مبارکہ کے لیے ایک نہایت پرشکوہ اور پُرجلال تمہید اور آغازِ کلام ہے۔ تسبیح باری تعالیٰ کا مفہوم اس سے پہلے سورۃ التغابن کے درس کے ضمن عرض کیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ نوٹ فرمالیں کہ سورۃ الصّف میں اس کا ذکر صیغہ ماضی میں تھا: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ جبکہ یہاں فعل مضارع آیا ہے: ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس طرزِ بیان کو اختیار کر کے تسبیح باری تعالیٰ کے ضمن میں قرآن حکیم نے گویا زمان و مکان کا احاطہ کر لیا ہے۔ اللہ کی تسبیح اس کائنات میں ہر آن اور ہر لحظہ ہو رہی ہے اور کائنات کے ہر گوشے میں یہ عمل جاری ہے۔ ﴿مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ کے الفاظ پر غور کیجیے۔ یہ دراصل کل سلسلۂ کون و مکان' کل کائنات کے احاطے کے لیے قرآن حکیم میں مستعمل ہیں۔ اسی طرح فعل ماضی اور فعل مضارع کو جمع کر لیجیے تو کل زمان کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ فعل مضارع عربی زبان میں حال اور مستقبل دونوں کو محیط ہے۔ چنانچہ تسبیح کے لفظ کو ماضی اور مضارع میں لا کر قرآن حکیم نے گویا زمان کا احاطہ بھی کر لیا ہے۔

اللہ کے چار اسماءِ حسنیٰ اور نبی اکرمﷺ کے فرائض چہارگانہ

اس آیۂ مبارکہ کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے چار اسماء وارد ہوئے ہیں اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ قرآن مجید میں اللہ کے اسماء وصفات عام طور پر آیات کے آخر میں وارد ہوتے ہیں' لیکن اکثر و بیشتر جوڑوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ مثلاً وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ' وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ' وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ —— وَقِسْ عَلٰى ذٰلِكَ۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اکٹھے چار اسماء وارد ہوئے ہیں۔ نوٹ کیجیے کہ اس کا اصل سبب اس سورۂ مبارکہ کا عمود ہے۔ ذہن میں تازہ کیجیے کہ اس مرکزی آیت میں جس پر ہم غور کر چکے ہیں' نبی اکرمﷺ کے طریق کار کے ضمن میں چار اصطلاحات آئی ہیں' یا یوں کہہ لیجیے کہ آپؐ کی چار شانوں کا ذکر ہے: تلاوتِ آیات' تزکیہ' تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت۔ درحقیقت ان چاروں کا بڑا گہرا ربط ہے ان چار اسماءِ حسنیٰ کے ساتھ! —— وہ ''الملک'' ہے۔ یعنی بادشاہِ ارض و سماوات ہے۔ چنانچہ اس کی آیات پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں' جیسے کوئی منادی کرنے والا شہنشاہ کے فرامین (proclamations) لوگوں کو سنا رہا ہو۔ گویا ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ عکس ہے اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی ''اَلْمَلِكُ'' کا۔ دوسری شان اللہ کی یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ اَلْقُدُّوْسُ ہے' یعنی انتہائی پاک۔ غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ قدوسیت کا بڑا گہرا تعلق ہے نبی اکرمﷺ کے بارے میں بیان کردہ دوسری اصطلاح ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ یعنی عمل تزکیہ کے ساتھ —— اسی طرح ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ (وہ تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب یعنی احکامِ شریعت کی) میں اللہ تعالیٰ کی شان ''العزیز'' کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ زبردست ہے' مختارِ مطلق ہے' وہ جو چاہے حکم دے' بندوں کا

کام ہے اس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت! سورۃ التغابن میں یہ مضمون آ چکا ہے: ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ''سنو اور اطاعت کرو''۔ سورۃ البقرۃ میں سود کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ کان کھول کر سن لو! اللہ نے سود حرام کیا ہے اور بیع کو حلال ٹھہرایا ہے، تم کون ہوتے ہو اُس پر اعتراض کرنے والے؟ یہ ہے ''العزیز'' کا مفہوم۔ یعنی ایک ایسی ہستی جس کے اختیارات پر کوئی تحدید نہ ہو، کوئی limitations نہ ہوں، کوئی checks & balances نہ ہوں، مختارِ مطلق!

اور آخری اور چوتھا لفظ جو اللہ کی شان میں آیا ہے ''اَلْحَكِيْمُ'' اس کا ربط و تعلق گویا از خود ظاہر ہے نبی اکرم ﷺ کے فرائض چہارگانہ میں سے چوتھے کے ساتھ ہے جو درحقیقت نبی اکرم کے اساسی منہاج کا نقطۂ عروج ہے، یعنی تعلیمِ حکمت!

تو پہلی آیت کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ایک پُرشکوہ اور پُرجلال تمہید ہے۔ اور اس کے بعد آئی وہ آیت جس پر ہم غور کر چکے:

﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

اس ''هُوَ'' کو جوڑ لیجیے پہلی آیت کے ساتھ کہ محمد ﷺ کا بھیجنے والا ہے کون؟ وہ کہ جس کی تسبیح میں آسمان و زمین کی ہر شے ہمیشہ سے اور ہر آن لگی ہوئی ہے اور وہ ہمیشہ ہمیش تسبیح میں لگی رہے گی، جو الملک ہے، القدوس ہے، العزیز ہے، الحکیم ہے۔ وہ ہے کہ جس نے اٹھایا اُمّیین میں سے ایک رسول جو انہی میں سے ہے۔ جہاں تک ان اصطلاحات کا تعلق ہے ان پر تو ہم کسی درجے میں غور و فکر کر چکے ہیں، اب ہمیں اس آیۂ مبارکہ کے بعض دوسرے پہلوؤں پر توجہ مرتکز کرنا ہے۔

اُمّی کا مفہوم

اُمّیین جمع ہے اُمّی کی یہ لفظ ''اُم'' سے بنا ہے۔ ''اُم'' عربی زبان میں ماں کے لیے مستعمل ہے۔ ''اُمی'' سے گویا ایک ایسی کیفیت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جیسے کوئی شخص بطنِ مادر سے برآمد ہوا ہو اور وہ اسی طرح کی کیفیت میں برقرار رہے۔ تو اگرچہ اس اعتبار سے ایک سے زائد مفہوم لیے جا سکتے ہیں، لیکن اس لفظ کا استعمال خاص طور پر ان لوگوں کے لیے ہے کہ جن کے ہاں رواجی تعلیم یعنی لکھنے پڑھنے کا رواج نہ ہو۔ قرآن مجید نے اصطلاحاً یہ لفظ استعمال کیا ہے بنی اسماعیل کے لیے، اس لیے کہ اوّلاً ان میں پڑھنے لکھنے کا رواج ہی بہت کم تھا اور ثانیاً یہ کہ بنی اسماعیل کے لیے یہ لفظ لایا جاتا ہے بنی اسرائیل کے مقابلے میں، اس لیے کہ وہ اہل کتاب تھے، ان کے ہاں لکھنے پڑھنے کا باقاعدہ رواج تھا۔ ان کے ہاں شریعت تھی، قانون تھا، عدالتیں تھیں، فقہاء تھے، مفتی تھے، لہٰذا بنی اسرائیل کے پس منظر میں یہ بنی اسماعیل اُمی اور اَن پڑھ تھے، ان کے پاس کوئی قانون، کوئی ضابطہ، کوئی کتاب نہیں تھی، یہاں تک کہ لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا۔

یہاں نوٹ کر لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت اوّلین ''اُمّیین'' میں تھی۔ آپ کے مخاطب اوّلین یہی اُمی تھے، اصلاً آپ کی بعثت انہی میں ہوئی۔ ''مِنْهُمْ'' کا لفظ اس حقیقت کی جانب رہنمائی دے رہا ہے۔ بلکہ اس کے حوالے سے مزید اشارہ کر دیا گیا اس بات کی طرف کہ کسی نبی اور رسول کے لیے اس قوم میں سے ہونا جس کی جانب وہ نبی یا رسول بنا کر بھیجے گئے، درحقیقت اس کے فرائض رسالت اور منصبِ نبوت کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ نبی اس قوم کا جانا پہچانا فرد ہوتا ہے جس کی سیرت و کردار سے وہ واقف ہیں، جو انہی کی زبان بولتا ہوا آتا ہے، اجنبیت کا کوئی پردہ اس کے اور قوم کے درمیان حائل نہیں ہوتا۔ یہی دلیل قرآن استعمال کرتا ہے اس اعتراض کے جواب میں کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے کسی فرشتے کو نبی بنا کر کیوں نہیں بھیجا جاتا: ﴿لَوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا﴾ کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو ہم لازماً کسی فرشتے ہی کو پیغامبر بنا کر بھیجتے، جب یہاں انسان آباد ہیں تو ہم نے انسانوں ہی میں سے انبیاء کو مبعوث فرمایا جن کے احساسات وہی ہوں جو دوسرے انسانوں کے ہیں، جن کے مسائل وہی ہوں جن سے دوسرے انسان دوچار ہوتے ہیں، پیٹ انہیں بھی لگا ہوا

ہو' جسم و جان کے تقاضے ان کے ساتھ بھی ہوں' تاکہ وہ اپنے جیسے انسانوں پر تبلیغ کریں تو اتمامِ حجت کر سکیں' کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ جس بات کی تم تبلیغ کر رہے ہو یا جو عملی نمونہ تم ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو انسانوں کے لیے قابلِ عمل نہیں ہے!

اب آیئے اس آیۂ مبارکہ کے آخری ٹکڑے کی جانب: ﴿وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ ''اور اگرچہ وہ پہلے کھلی گمراہی میں تھے''۔ بنو اسماعیل کی گمراہی کی تفصیل یہاں بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ ان کے اوہام' ان کے مشرکانہ عقائد' ان کی اخلاقی زندگی کا نقشہ معلوم و معروف ہے۔ ''ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ'' کے مصداق وہ تہہ در تہہ گمراہیوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ فکر کی' عقیدے کی' عمل کی' اخلاق کی' غرضیکہ ہر اعتبار سے وہ کجی اور گمراہی کا شکار تھے۔ پھر یہ کہ ان کے معاشرے میں کوئی نظام تھا نہ تنظیم' ہر ایک اپنی جگہ فرعون بے ساماں ہے' کوئی کسی کی بات سننے والا نہیں۔ ﴿وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ میں گویا اس پوری صورت حال کا ایک نقشہ کھینچ دیا گیا۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے دو رُخ

آگے فرمایا: ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ﴾ آیت کا یہ ٹکڑا عطف ہو رہا ہے اُمِّيّٖن پر کہ دوسرے کچھ اور بھی ہیں جن کی طرف آپ کو مبعوث فرمایا گیا۔ یعنی بَعَثَ فِی الْاُمِّيّٖنَ وَالْاٰخِرِيْنَ مِنْهُمْ ۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت اولاً ہوئی ہے اُمیین میں' لیکن آپؐ صرف اُمیین کے رسول بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ ''آخرین'' یعنی دیگر اقوام کے لیے بھی آپ ﷺ رسول بن کر تشریف لائے تھے۔

اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ آپ کی ایک بعثت خصوصی تھی اہل عرب کی طرف' بنو اسماعیل کی طرف' اُمیین کی طرف' جبکہ ایک بعثت عمومی تھی اِلٰی كَافَّةً لِّلنَّاسِ یعنی پوری نوعِ انسانی کی جانب۔ جیسے کہ فرمایا گیا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ ''اور اے نبی! ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر''۔ ''نہج البلاغہ'' نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ نبوت کے ابتدائی دور کے ایک خطبے میں آپؐ کے یہ الفاظ منقول ہیں: ((وَاللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ' اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَاِلَى النَّاسِ كَافَّةً)) ''اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری جانب بالخصوص اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم'' تو یہ ہے مفہوم اُمیین اور آخرین کا۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ یہ آخرین سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی قوم۔ آپؐ نے مزید فرمایا کہ حکمت اور دانائی کی کوئی بات اگر ثریا پر بھی ہوگی تو اس کی قوم کا کوئی نہ کوئی فرد وہاں سے بھی لے آئے گا۔

یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے کہ اُمت محمدیہؐ کی تشکیل کچھ اس طرز پر ہے کہ اس کا ایک مرکز (Nucleus) ہے جو بنی اسماعیل پر مشتمل ہے جو نبی اکرم ﷺ کے اوّلین مخاطب تھے۔ خود نبی اکرم ﷺ ان ہی میں سے تھے' ان ہی کی زبان بولتے ہوئے آئے۔ آپؐ نے اوّلاً ان ہی کو تبلیغ فرمائی' انہی کے اندر سے ایک اُمت تشکیل فرمادی۔ اس کے بعد پھر دوسری اقوام سے' دوسری نسلوں اور دوسرے ملکوں سے لوگ گویا تہہ در تہہ دائروں کی شکل میں اس امت میں شامل ہوتے چلے گئے۔ ایرانی آئے' تورانی آئے' ہندی آئے' بربر آئے' ایشیائی آئے' افریقی آئے۔ یہ سب ''آخرین'' میں شامل ہیں۔ تو نبی اکرم ﷺ کی بعثتیں دو ہوئیں: اوّلین بعثت اُمیین میں اور ثانوی بعثت آخرین میں۔

﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ﴾ کے الفاظ پر توجہ فرمایئے' یہاں ''مِنْهُمْ'' معنوی مفہوم میں آیا ہے یعنی جو بھی دائرہ اسلام میں آجائے گا' چاہے وہ ہندی ہو' وہ مشرقِ بعید کا زرد رو انسان ہو' افریقہ کا سیاہ فام ہو' یورپ کا سرخ و سفید رنگ کا حامل ہو' یہ سب ملت کی وحدت میں گم ہوتے چلے جائیں گے' ایک ملت بنتی چلی جائے گی۔ اسی جانب اشارہ ہے ''مِنْهُمْ'' میں کہ یہ ایک ہی اُمت ہے' بعد میں آنے والے اسی امت کا جزو بنتے چلے جائیں گے۔ ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ کہ نبی اکرم کی بعثت ہوئی

آخرین میں بھی اور جو ابھی ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے' ہو جائیں گے۔ ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ اور وہ (اللہ) العزیز ہے' الحکیم ہے''۔ اس آخری اور کامل نبوت و رسالت کے بارے میں اس کی حکمت تامہ کا یہ تقاضا ہوا کہ وہ آپؐ کو دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمائے۔ وہ العزیز ہے' زبردست ہے' جو چاہے کرے' اور الحکیم ہے' اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں —— ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے' دیتا ہے جس کو چاہتا ہے''۔ ﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ ''اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے''۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

یہاں یہ اشارہ کر دیا گیا کہ یہ درجہ بدرجہ فضل کا معاملہ ہے۔ اللہ کا سب سے بڑھ کر فضل ہوا محمد رسول اللہ ﷺ پر۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا﴾ کہ اے نبی (ﷺ) آپ پر اس کا بہت بڑا فضل ہوا۔ آپؐ کو وہ مقام و مرتبہ حاصل ہو گا جسے مقامِ محمود سے تعبیر فرمایا گیا ہے: ﴿عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ تو اوّلین اور بلند ترین فضیلت حاصل ہوئی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو جو سید الاوّلین والآخرین ہیں' سید الانبیاء ہیں' امام الرسل ہیں۔ پھر بقیہ نوعِ انسانی کے مقابلے میں ایک درجہ فضیلت کا حاصل ہوا اُمّیین کو یعنی بنو اسماعیل کو ؏

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

اب یہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور دین ہے کہ اس نے عربوں کو چن لیا اور ان میں اپنا آخری نبی مبعوث فرمایا' ان کی زبان میں اللہ کا آخری کلام نازل ہوا' جو طور طریقے ان کے ہاں رائج تھے انہی میں قطع و برید کر کے آخری اور کامل شریعت کا تانا بانا تیار کیا گیا۔ یہ بات اس سے پہلے سورۃ الحج کے آخری رکوع میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ﴾ کسی غیر ابراہیمی نسل کے انسان کے لیے مغائرت کا کوئی معاملہ ہو سکتا ہے۔ زبان کا حجاب ایک بڑی رکاوٹ ہے' پھر نسلی اور موروثی عادات و خصائل کا معاملہ ہے جو منافرت کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکن اے بنو اسماعیل! تمہارے لیے تو کوئی غیریت نہیں' کوئی اجنبیت نہیں' تمہارے جو موروثی مراسم تھے ان ہی میں سے اکثر و بیشتر کو معمولی سی قطع و برید کے بعد اس آخری شریعت کا جزء بنا لیا گیا۔ یہ طواف تمہارے ہاں ہوتا چلا آ رہا تھا' قربانی کی رسم تمہارے ہاں چلی آ رہی تھی' منیٰ اور عرفات کا قیام کسی نہ کسی درجے میں تمہارے ہاں جاری تھا' تلبیہ تمہارے ہاں مروج تھا' اگرچہ اس میں تم نے اپنی طرف سے بعض شرکیہ کلمات شامل کر لیے تھے۔ گویا مجموعی طور پر وہ پورا ڈھانچہ (structure) موجود تھا جس میں ترمیم و اضافہ کر کے آخری شریعت کا تانا بانا تیار ہوا۔ تو یہ بلاشبہ ایک فضیلت کا مقام ہے جو انہیں حاصل ہوا۔ پھر درجہ بدرجہ یہ فضیلت حاصل ہے نوعِ انسانی کے ہر اُس فرد کو جو دامنِ محمدیؐ سے وابستہ ہو جائے' جو ملت اسلامیہ میں شامل ہو جائے' جو اس اُمت محمدیہ (علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ والسّلام) میں شریک ہو جائے۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾

یہود کا ذکر —— بطورِ نشانِ عبرت

اب اگلی آیت میں یہود کا تذکرہ ہے۔ اور یہ بات اس سے قبل ''المُسَبِّحات'' کے تعارف کے ضمن میں اصولاً بیان کی جا چکی ہے' جس کی ایک بڑی واضح اور نمایاں مثال سورۃ الصّف میں ہمارے سامنے آ چکی ہے' کہ ان سورتوں میں اگرچہ اصلاً خطاب اُمت مسلمہ سے ہے' لیکن سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو بطور نشانِ عبرت مسلمانوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ ہر سورت میں بنی اسرائیل یعنی یہود میں اعتقادی یا عملی گمراہیوں کا وہی پہلو زیر بحث آئے گا کہ جو اس سورت کے عمود سے متعلق ہو۔ جہاد و قتال کا مضمون سورۃ الصّف میں مذکور تھا تو وہاں اس خاص پہلو سے ان کا جو معاملہ رہا اور قتال فی سبیل اللہ سے انکار کر کے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس قدر شدید ذہنی اذیت سے دوچار کیا' اسے نمایاں کیا گیا کہ مسلمانو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اس روش کو اختیار کر لو! اب غور کیجیے کہ یہاں سورۃ الجمعہ میں ساری گفتگو قرآن مجید کے گرد گھوم رہی ہے۔ واضح کر دیا گیا کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا

آلۂ انقلاب قرآن حکیم ہے‘ مزید یہ کہ نبی اکرمﷺ صرف اُمّیین کے لیے رسول ہو کر نہیں آئے پوری نوعِ انسانی کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

کتاب اللہ کا وارث کون؟

یہی وجہ ہے کہ سیرتِ طیبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپﷺ نے اسی قرآن کے ذریعے انزار وتبشیر کا فریضہ سرانجام دیا‘ اسی کے ذریعے تذکیر فرمائی‘ اور اسی کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں اُمّیین میں سے ایک اُمت تیار فرما دی‘ اسے تربیت وتزکیہ کے مراحل سے گزارا‘ اسے نہ صرف یہ کہ کتاب وشریعت کی تعلیم دی بلکہ کتاب کا ایک بھرپور عملی نمونہ اس کے سامنے پیش کر کے دکھا دیا‘ اور پھر حجۃ الوداع کے موقع پر اُمت سے یہ گواہی لینے کے بعد کہ: ’’اِنَّا نَشْهَدُ اِنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ‘‘ (اے نبیﷺ! ہم گواہ ہیں کہ آپ نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا‘ اللہ کی امانت درست طور پر پہنچا دی اور نصح وخیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔) خطبے کے آخر میں فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) کہ جو یہاں موجود ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس پیغامِ حق کو پہنچائیں ان تک کہ جو یہاں موجود نہیں۔ غور کیجیے‘ یہی واحد لائحہ عمل ممکن تھا‘ اس کے سوا کوئی صورت حال قابل عمل نہیں تھی‘ اس لیے کہ نبی اکرمﷺ اگر پوری نوعِ انسانی کے لیے رسول ہیں‘ اور بلاشک وشبہ ہیں‘ تو یا تو یہ صورت ہوتی کہ آپؐ کی حیاتِ دُنیوی قیامت تک دراز کر دی جاتی تا کہ آپؐ اپنے فرائض رسالت خود بنفس نفیس ادا فرماتے رہتے‘ پھر جو کوئی آپؐ کا ساتھی بنتا وہ دعوت وتبلیغ کے کام میں آپؐ کا دست و بازو بنتا جاتا‘ آپؐ کے اعوان وانصار بنتے‘ آپؐ کے مشن کی تکمیل کے لیے اپنی جانیں دیں اور اپنی جان اور مال اس راہ میں کھپایا۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً تبلیغ دین کا کام قیامت تک براہِ راست نبی اکرمﷺ ہی کی زیرسرکردگی جاری رہتا۔ لیکن جب نبی اکرمﷺ کا وصال ہو گیا تو اب ایک ہی راستہ ممکن تھا کہ وہ اُمت جو آپؐ نے تیار فرما دی‘ اللہ کا پیغام نوعِ انسانی تک پہنچانے کی ذمہ دار بنے‘ وہ اسی قرآن کو ہاتھ میں لے کر نکلے اور اس کی

(۱)

ہدایت تامہ سے پورے روئے ارضی کو منور کرے‘ قرآن کی تعلیمات کو عام کرے اور اس کی تبلیغ کا فریضہ ادا کرے‘ بلکہ اس کا حق ادا کر دے۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں!

اسی حوالے سے خطبہ حجۃ الوداع کا ایک اور جملہ بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ نبی اکرمﷺ نے فرمایا: ((قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا‘ كِتَابَ اللّٰهِ))(۱) ’’لوگو! میں چھوڑ کر جا رہا ہوں تمہارے مابین وہ چیز کہ اگر تم نے اس کو تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے‘ اور وہ ہے اللہ کی کتاب!‘‘ —— غور کیجیے کہ یہاں ’’اعتصام‘‘ کا لفظ آیا ہے۔ اس کا تعلق جوڑ لیجیے سورۃ الحج کے درس کے ساتھ۔ وہاں ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ﴾ کے الفاظ وارد ہوئے تھے اور میں نے عرض کیا تھا کہ اعتصام باللہ کی قدرے وضاحت کے لیے میں نے قرآن مجید کے بارے میں نبی اکرمﷺ کا یہ قول سنایا تھا کہ: ((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ))(۱) (یہ قرآن ہے اللہ کی مضبوط رسی)۔ یہاں خطبہ حجۃ الوداع میں یہی بات آئی کہ ((قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ))(۱) کہ اے مسلمانو! میں تمہارے حوالے کر کے جا رہا ہوں وہ کتاب کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہ ہو گے —— تو جان لیجیے کہ انبیاء کے بعد ان کی اُمتیں کتاب کی وارث ہوا کرتی ہیں‘ وراثت کتاب کا مضمون سورۃ الشوریٰ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ﴾ ایک شکوے کے سے انداز میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ وہ لوگ یا وہ اُمتیں جو نبیوں کے بعد ان کی کتابوں کی وارث بنتی ہیں وہ اس کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ کتاب کے وارث ہونے کے ناطے اُمت کا فرضِ منصبی یہ بنتا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب کو ہاتھ میں لے کر اُٹھ کھڑی ہو اور اس کے نورِ ہدایت سے چہار دانگ عالم کو منور کر دے۔ اے مسلمانو! اگر تم یہ فرضِ منصبی ادا نہیں کرو گے تو جان لو کہ پھر تمہارا طرزِ

(۱)

عمل وہ ہوگا جو اس سے پہلے یہود اختیار کر چکے ہیں، اور جس کی پاداش میں انہیں مغضوب علیہم قرار دیا جا چکا ہے ـــــ یہاں وہ ربط اب معین ہو گیا۔ اگلی آیات کے مضامین کا اس سورت کے مرکزی مضمون کے ساتھ درحقیقت یہی ربط ہے۔

تورات کے ساتھ یہود کا طرزِ عمل ـــ ایک عبرت ناک مثال

فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵﴾

کہ تم سے پہلے بھی ایک اُمت حامل کتاب بنائی گئی تھی، تورات جیسی نعمت اسے عطا ہوئی تھی۔ حامل کا لفظ ''حَمَلَ يَحْمِلُ'' سے اسم الفاعل ہے۔ اس کا مفہوم ہے ''بوجھ اٹھانے والا''۔ اسی طرح ''حَمَّالٌ'' کہتے ہیں بوجھ اٹھا کر لے جانے والے کو۔ عربی زبان میں یہ لفظ عام طور پر مزدور کے لیے مستعمل ہے، یعنی وہ شخص جس کا کام ہی یہ ہے کہ بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرے۔ گویا حامل کتاب الٰہی اُس قوم کو کہا جائے گا جس کے ذمے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کو دوسروں تک پہنچائے، اسے پھیلائے، اس کی ہدایت کو عام کرے۔ یہ کتاب رسول ﷺ کے ذریعے تم تک پہنچی ہے، اب اس کو پوری نوعِ انسانی تک پہنچانا تمہارے ذمے ہے۔ لیکن یہود نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا﴾ ''مثال ان لوگوں کی جو حامل تورات بنائے گئے (جو اٹھوائے گئے تورات)، پھر انہوں نے اسے نہ اٹھایا (اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا) ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ﴾ ''اس گدھے کی سی (مثال) ہے جو اٹھائے ہوئے ہو کتابوں کا بوجھ!'' یہاں یہود کو اس گدھے کے مثل قرار دیا گیا ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔

عربی زبان میں سِفر اور سَفر دونوں کی جمع اَسفار آتی ہے۔ سفر کے معنی ہیں کتاب۔ چنانچہ تورات میں شامل کتابوں (یا ابواب) کے لیے یہی لفظ مستعمل ہے، مثلاً سِفرِ پیدائش، سِفرِ تقسیم (The Book of Genesis) وغیرہ۔ اس اعتبار سے یہاں آیت زیرِ نظر میں ''اَسفار'' کا لفظ اپنے اندر بڑی معنویت لیے ہوئے ہے۔

﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ﴾ یہ تمثیل بھی نہایت بلیغ ہے۔ گدھے کی پیٹھ پر مکالماتِ فلاطوں کی سو جلدوں کی گٹھڑی باندھ کر رکھ دیجیے، اس سے اس کے اندر نہ تو کوئی فلسفیانہ بصیرت پیدا ہو گی اور نہ ہی حکمت اور دانائی کی کوئی بات اسے حاصل ہو گی۔ یہ مثال ہے اُس قوم کی جو کتابِ الٰہی کی حامل بنائی جائے اور پھر وہ اس کا حق ادا نہ کرے، اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کرے! اگرچہ یہ تمثیل ایک بار تو انسان کو چونکا دیتی ہے کہ تورات کی حامل اُمت کے لیے گدھے کی مثال! لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی نکمی شے کے اندر شناعت اور گراوٹ کا جو پہلو موجود ہوتا ہے اسے واضح کرنے کے لیے کوئی ایسی تمثیل مؤثر ہوتی ہے جس سے طبیعت میں ایک دفعہ لرزش سی پیدا ہو جائے۔ فصاحت اور بلاغت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

تکذیب حالی

آگے فرمایا: ﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''بری ہے مثال اُس قوم کی جنہوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا'' ـــ یہاں لفظ ''تکذیب'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تکذیب قول سے بھی ہو سکتی ہے اور عمل سے بھی۔ یعنی تکذیب باللسان بھی ہو سکتی ہے اور بالحال بھی۔ یہ بھی تکذیب ہی کی ایک صورت ہوتی اگر بنی اسرائیل زبان سے صاف کہہ دیتے کہ تورات اللہ کی کتاب نہیں ہے، لیکن تاریخ کی گواہی یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے اس معنی میں تورات کی تکذیب کبھی نہیں کی۔ ہاں تکذیب عملی کے وہ ضرور مرتکب ہوئے۔ وہ تکذیب عملی کہ جس کا نقشہ بدقسمتی سے آج اُمت مسلمہ پیش کر رہی ہے کہ بجائے قرآن کو اپنا پیشوا، رہنما اور مشعل راہ بنانے کے اُمت کی عظیم اکثریت نے اسے طاقِ نسیاں پر رکھ چھوڑا ہے۔ قرآن نے اس طرزِ عمل کو تکذیب کے لفظ سے موسوم کیا ہے: ﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ﴾ یہ اللہ کی آیات کی تکذیب نہیں تو اور کیا ہے! زبان سے چاہے قرآن مجید پر کتنا ہی ایمان کا دعویٰ کیا

جائے‘ اگر قرآن مجید کو ہم نے اپنا امام نہیں بنایا‘ قرآن مجید کی رہنمائی کو عملاً اختیار نہیں کیا‘ قرآن مجید کے عطا کردہ ضابطے اور قانون کو نافذ نہیں کیا‘ اس کی تعلیمات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو استوار نہیں کیا تو گویا کہ اپنے عمل سے ہم قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں۔ یہ تکذیب حالی ہے۔

اُمت مسلمہ کے لیے ایک پیشگی تنبیہہ

اب آیئے آیت کے آخری ٹکڑے کی طرف: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ''اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا''۔ نوٹ کیجیے‘ یہ وہی انداز ہے جو سورۃ الصّف میں آ چکا ہے۔ وہاں ظالم کی بجائے فاسق کا لفظ تھا: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ اسلوب اور اسٹائل بعینہٖ وہی ہے۔ یہ چیز اُن مشترک اوصاف میں سے ہے جو جڑواں سورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ بہرحال اس آیۂ مبارکہ سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی کہ کتابِ الٰہی کے حامل ہونے کے ناطے ہر اُمت اور ہر قوم پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں‘ اگر اُن ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا جائے تو درحقیقت یہ طرزِ عمل تکذیب کتاب کے مترادف ہے۔ یہ ایک پیشگی تنبیہہ تھی اُمت مسلمہ کو کہ اے مسلمانو! کہیں یہی معاملہ تم کتاب اللہ کے ساتھ نہ کر بیٹھنا! یہی وہ بات ہے جو نبی اکرم ﷺ کے ایک نہایت جامع فرمان میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ فرمایا: ((يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ))(۱) ''اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ نہ بنا لینا''۔ وسادہ کہتے ہیں تکیے کو۔ یہ جملہ دو مفہوم دے رہا ہے (۱) تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے‘ اس اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا۔ اور (۲) تکیے پر انسان سہارا لیتا ہے۔ اور ایک سہارا ذہنی اور نفسیاتی بھی ہوتا ہے۔ اس پہلو سے مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کو اس طرح کا ذہنی اور نفسیاتی سہارا نہ بنا بیٹھنا کہ ہم تو حامل کتاب ہیں‘ قرآن کے وارث ہیں‘ محمد ﷺ کے اُمتی ہیں۔ اس طرح کا ذہنی سہارا بسا اوقات بے عملی کو جنم دیتا ہے۔ چنانچہ روک دیا گیا کہ قرآن کو اس نوع کا ایک ذہنی سہارا نہ بنا لینا‘ بلکہ تمہاری

(۱)

اصل توجہ اس جانب ہونی چاہیے کہ قرآن کے حوالے سے ہم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں‘ قرآن کے ساتھ ہمارا عملی رویہ کیا ہونا چاہیے‘ اور یہ کہ قرآن مجید کے وہ کون کون سے حقوق ہیں جن کی ادائیگی کی فکر ہر مسلمان کو کرنی ہے اور ان کی ادائیگی کی عملی صورت کیا ہے؟

قرآن حکیم اور ہماری ذمہ داریاں

نبی اکرم ﷺ کی جس حدیث شریف کا ابھی ذکر ہوا تھا اس میں اس پیشگی تنبیہہ کے بعد کہ ((يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ)) ''اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ اور ذہنی سہارا نہ بنا لینا'' آپؐ نے بڑی جامعیت کے ساتھ ان اساسات کو واضح فرمایا‘ کہ جن پر قرآن حکیم کے ساتھ اُمت مسلمہ کے صحیح تعلق کا دار و مدار ہے‘ اور جن کی بجا آوری کی اُمت کو فکر کرنی چاہیے۔ فرمایا: ((وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ فِيْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ))(۱) ''اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے‘ رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی''۔ ((وَتَغَنَّوْهُ)) ''اور اسے خوش الحانی سے پڑھا کرو!'' اس لیے کہ ہر انسان کو کسی نہ کسی درجے میں حسن سماعت سے بھی حصہ ملتا ہے۔ بندۂ مؤمن کے لیے اپنی فطرت کے اس تقاضے کو پورا کرنے کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ اچھی سے اچھی آواز میں اور بہتر سے بہتر انداز میں قرآن مجید کو پڑھے اور اس سے حظ حاصل کرے۔

آگے فرمایا: ((وَافْشُوْهُ)) ''اور اسے پھیلاؤ''۔ اسے عام کرو! حضرت مسیح علیہ السلام نے بڑی پیاری بات فرمائی تھی کہ چراغ جلا کر اسے کہیں نیچے نہیں رکھا کرتے‘ بلکہ بلند مقام پر رکھتے ہیں تاکہ اس کی روشنی عام ہو۔ یہ نورِ ہدایت‘ قرآنِ حکیم نوعِ انسانی کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے۔ جس کا نقشہ کھینچا گیا اس شعر میں ؎

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

(۱)

بھٹکتے ہوئے قافلہ انسانیت کے لیے قندیل ہدایت یہی قرآن ہے۔ اس کو پھیلانے اور عام کرنے کی نبی اکرم ﷺ نے تاکید فرمائی۔ اسی کی جانب اشارہ فرمایا آپ ؐ نے اپنے آخری خطبے میں: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبُ))(۱) ''کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں انہیں چاہیے کہ اس پیغام کو پہنچائیں ان تک جو یہاں موجود نہیں''۔ اور اس بات کو منطقی انتہا تک آپ ؐ نے پہنچا دیا اپنے اس قولِ مبارک کے ذریعے کہ: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً))(۱) ''پہنچاؤ میری جانب سے' خواہ ایک ہی آیت ہو''۔ چراغ سے چراغ اسی طور سے روشن ہو گا۔ اس ضمن میں آپ ؐ کا یہ ارشاد بھی نہایت اہم ہے: ((خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))(۱) ''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے'' جو قرآن کے پڑھنے پڑھانے کو اپنی زندگی کا مشن بنالے۔ حضرت عثمان ؓ اس حدیث کے راوی ہیں اور متفق علیہ روایت ہے۔ یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں: ((وَتَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ)) (۱) ''اس پر غور وفکر کرو (اس کے مفاہیم ومعنی کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرو) تاکہ تم فلاح اور کامیابی سے ہمکنار ہوسکو!''

اسی سلسلے میں ایک اور حدیث بھی جس کے راوی حضرت علی ؓ ہیں' انتہائی توجہ کے لائق ہے۔ نبی اکرم ﷺ قرآن کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ((وَلَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ)) ''اور یہ کتاب وہ ہے جس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے'' ((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ)) ''اور اہل علم اس سے کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے'' ((وَلَا يخلق عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ))(۱) ''بار بار کے پڑھنے کے باوجود (اس سے طبیعت اکتائے

(۱)

(۱)

(۱)

(۱)

گی نہیں) اس پر پرانے پن کا کوئی احساس کبھی پیدا نہ ہونے پائے گا''—— یہ ہے اللہ کی کتاب' جس کے حقوق کی ادائیگی ہم سب کو فکر ہونی چاہیے۔

اس موضوع پر اللہ کے فضل وکرم سے مَیں نے کسی زمانے میں مسجد خضریٰ لاہور میں دو تقریریں کی تھیں جو اَب ایک کتابچے کی شکل میں موجود ہیں' جس کا عنوان ہے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' یہ کتابچہ یوں سمجھئے کہ نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث ہی کی وضاحت پر مشتمل ہے کہ ''اے مسلمانو! حامل قرآن ہونے کے اعتبار سے پہچانو کہ تمہاری ذمہ داریاں کیا ہیں' تمہارے فرائض کیا ہیں! اس کو مانو جیسا کہ ماننے کا حق ہے' اسے پڑھو جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے' اس کو سمجھو جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے' اس پر عمل کرو جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے' اور آخری ذمہ داری یہ کہ اس کو پھیلاؤ' اس کی تبلیغ و تبیین کرو جیسا کہ اس کی تبلیغ کا حق ہے''۔ چہار دانگ عالم کو اس کے نور سے منور کرنے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں خرچ کرنا اور کھپانا ہر مسلمان پر اس کتاب عزیز کا وہ حق ہے جسے ہم فراموش کیے ہوئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت چونکہ ((اِلٰى كَافَّةَ النَّاسِ))(۱) تھی' یعنی آپ ؐ تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں' لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے تبلیغ وتعلیم قرآن کے ذریعے ایک مخصوص خطہ زمین میں ایک انقلابِ عظیم برپا فرما دیا اور وہاں بسنے والی قوم کو وہ نسخۂ کیمیا قرآن مجید عطا فرما کر آپ ؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اب اُمت کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا کہ وہ اس چراغ کو لے کر نکلے اور اس کے نور سے روئے ارضی کو منور کر دے ؎

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

ذہن میں رکھیے کہ صحابہ کرام ؓ کو اپنے اس فرضِ منصبی کا پورا شعور حاصل تھا۔ چنانچہ ان کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا تو دوسرے میں تلوار! حقیقت یہ ہے کہ ایک مردِ

(۱)

(۱)

مؤمن کی شخصیت کا جو ہیولا انسان کے تصور میں اُبھرتا ہے اس میں لازماً یہ بات شامل ہوتی ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہے اور دوسرے میں تلوار۔ ایک طرف قرآن کو دوسروں تک پہنچانا' اس کے نورِ ہدایت کو عام کرنا اور دوسری جانب اللہ کے دین کے غلبے کے لیے اللہ اور اس کے دین کے دشمنوں سے جہاد اور قتال' یہ تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا نقشہ!

قرآن حکیم کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل

یہ ہے وہ کام کہ جو نبی اکرم ﷺ اُمت کے سپرد فرما کر گئے تھے۔ اس سلسلے میں پیشگی تنبیہہ سورۃ الجمعہ میں کر دی گئی کہ دیکھنا کہیں اس کے برعکس تمہارا طرزِ عمل یہود کا سا نہ ہو جائے' جنہوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ وفاداری نہیں کی تو اللہ نے انہیں اس گدھے کے مشابہ قرار دیا جس پر کتابوں کا بوجھ لدھا ہوا ہو۔

﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

''نہایت بری مثال ہے اس قوم کی جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا' اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

یہ بات دوسری ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا قول مبارک ہمارے میں پورا ہوا ہے کہ ((لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ)) اور ہم بعینہٖ یہود کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں' چنانچہ قرآن کے ساتھ ہمارا تعلق بس اتنا رہ گیا ہے کہ ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یاسین اُو آساں نمیری

قرآن ہمارے نزدیک محض ایصالِ ثواب یا حصولِ ثواب کا ایک ذریعہ ہے یا موت کو آسان کرنے کا ایک نسخہ کہ مرتے ہوئے سورۂ یٰسین سنا دی جائے تاکہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔ ہماری عملی زندگی کا قرآن حکیم سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ ہماری رہنما کتاب ہے' نہ یہ ہماری امام ہے' نہ یہ قولِ فیصل ہے کہ ہمارے تمام فیصلے اسی پر مبنی ہوں' نہ اس پر ہماری زندگی کا نظام استوار ہے۔ تو گویا بعینہٖ وہ بات کہ جو یہود کو نشانِ عبرت کے طور پر پیش کر کے ہمیں بطورِ تنبیہہ کہی گئی تھی ہماری بدبختی اور بدقسمتی کہ ہم پر صادق آ رہی ہے اور ہم اس وقت اپنی موجودہ صورت حال سے اس کا ایک مکمل نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

اگلی آیات میں یہ حقیقت کھولی گئی ہے کہ کسی مسلمان اُمت میں زوال اور گمراہی کا پیدا ہو جانا کن اسباب سے ہوتا ہے! بڑی جامعیت کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا گیا:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾

''(اے نبیؐ) کہیے: اے یہودیو! اگر تمہیں یہ زُعم ہے (اگر تمہیں یہ خیالِ خام لاحق ہو گیا ہے) کہ تم اللہ کے بڑے دوست ہو (اس کے چہیتے اور محبوب ہو) لوگوں کو چھوڑ کر' تو اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو!''

دوست سے ملاقات کی آرزو ہر شخص کو ہوتی ہے' اس سے دُوری تو انسان پر شاق گزرتی ہے۔

عملی اضمحلال کا اصل سبب

یہاں اشارہ ہوا اس بات کی طرف کہ کسی مسلمان اُمت میں عملی گمراہی اور اضمحلال کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہنوں میں بالعموم یہ خیالِ خام راسخ ہو جاتا ہے کہ ہم بخشے بخشائے ہیں' ہم اللہ کے چہیتے ہیں: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ () ہم اللہ کے برگزیدہ بندوں کی اولاد اور اس کے پسندیدہ بندوں کے ساتھ نسبت اور تعلق رکھنے والے لوگ ہیں' جہنم کی آگ ہمارے لیے نہیں کسی اور کے لیے ہے۔ اس زعم اور بے بنیاد خیال کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں تساہل اور عملی زوال شروع ہو جاتا ہے۔ پھر انسان اپنی نجات کے معاملے کو عمل کرنے کی بجائے ان تعلقوں اور نسبتوں پر موقوف سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں جھنجوڑنے کے لیے

ایک بڑی ہی عملی مثال سامنے لائی گئی کہ اگر تمہیں فی الواقع یہ خیال ہے کہ تمہیں خدا سے محبت ہے تو اس سے جلد سے جلد ملاقات کا جذبہ اور شوق تمہارے دل میں موجزن ہونا چاہیے۔ وہ جس کا نقشہ کھینچا علامہ اقبال نے ان الفاظ میں ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

اپنے گریبانو میں جھانکو' کیا واقعی یہ کیفیت ہے؟ کیا واقعی یہ زندگی تم پر اسی طرح بھاری گزر رہی ہے جیسے کہ حضور ﷺ نے نقشہ کھینچا تھا کہ: ((اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ))[۱] ''یہ دنیا ایک بندۂ مؤمن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے گلستان''۔ یا معاملہ اس کے برعکس ہے اور دنیا سے محبت کی کیفیت وہ ہے جو سورۃ البقرۃ میں یہود کی بیان ہوئی:

﴿وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ ج وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا ج یَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ ج﴾ (البقرۃ:۹۶)

کہ ان میں سے ہر ایک کی بڑی خواہش ہے کہ زندگی طویل ہو جائے' ایک ہزار برس تک وہ اس دُنیا میں جی سکیں اور یہاں کا لطف اٹھا سکیں' ان کی اصل کیفیاتِ باطنی تو یہ ہیں' دعویٰ کر رہے ہیں خدا کی محبت کا اور خدا کے محبوب ہونے کا۔

یہ ہے وہ پریکٹیکل ٹیسٹ جو اُن کے سامنے رکھ دیا گیا کہ اس پر اپنے آپ کو پرکھو۔ آیت کے اگلے ٹکڑے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا یَتَمَنَّوْنَہٗٓ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ ط﴾

''اور یہ ہرگز ہرگز تمنا نہیں کر سکتے موت کی' بسبب اس کمائی کے جو اُن کے ہاتھوں نے آگے بھیجی ہوئی ہے''۔

سورۃ القیامۃ میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ﴾ کہ انسان کو خوب معلوم ہوتا کہ وہ کہاں کھڑا ہے' کتنے پانی میں ہے۔ ﴿وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ﴾ خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں اور کتنے ہی بہانے تراش لے اور خواہ وہ اپنی استدلالی قوت سے اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بند کرا دے' لیکن اس سب کے باوجود اس کا ضمیر اسے بتا رہا ہوتا ہے کہ تم حقیقت میں کیا ہو —— چنانچہ صاف فرما دیا کہ یہ یہود اگرچہ خود کو اللہ تعالیٰ کا لاڈلا اور چہیتا قرار دیتے ہیں' لیکن جو کچھ یہ اپنے ہاتھوں سے آگے بھیج چکے ہیں' جو کمائی انہوں نے کی ہے آخرت کے نقطۂ نگاہ سے' اس کے پیشِ نظر یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کر سکتے۔ ﴿وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۷﴾﴾ ''اور اللہ ظالموں سے بخوبی باخبر ہے''۔

اگلی آیت میں یہ مضمون اپنی منطقی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْہُ فَاِنَّہٗ مُلٰقِیْکُمْ﴾ کہ (اے نبیؐ) ان سے کہہ دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو' جس سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی۔ کتنا ہی بھاگو' کتنا ہی اس سے پہلو بچانے کی کوشش کرو' وہ سامنے آ کھڑی ہو گی۔ ﴿ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ﴾ پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اس ہستی کی طرف کہ جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے ﴿فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾﴾ پھر وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔

اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ان آیات میں خطاب اگرچہ یہود سے ہے' لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا تھا ان سورتوں میں اصل مخاطب اُمتِ مسلمہ سے ہے' ساری بات مسلمانوں سے ہو رہی ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں

گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اصل میں اُمتِ مسلمہ کو گویا پیشگی طور پر متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارے اندر اگر عملی اضمحلال آئے گا' اپنے دینی مطالبات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے تم اگر پہلوتہی کرو گے تو اس کا اصل سبب یہ ہو گا کہ تمہیں یہ زعم لاحق ہو جائے گا کہ ہم اللہ کے چہیتے ہیں' ہم اس کے محبوبوں کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ زعم ہے جو تمہیں عمل سے دور کرتا چلا جائے گا اور اس کا ایک نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم دنیا پرستی میں غرق ہوتے چلے جاؤ گے۔ دنیا ہی تمہارا مطلوب

ومقصود بنتی چلی جائے گی اور دوسرے یہ کہ موت کا خوف رفتہ رفتہ تم پر مسلط ہو جائے گا۔

ایک چونکا دینے والی حدیث

نبی اکرم ﷺ نے خبر دی تھی کہ اے مسلمانو! ایک وقت آئے گا کہ دنیا کی قومیں تم پر ایک دوسرے کو ایسے دعوت دیں گی جیسے دعوت کا اہتمام کرنے والا کوئی شخص دستر خوان کے چنے جانے کے بعد مہمانوں سے کہتا ہے کہ آیئے تشریف لایئے' کھانا تناول فرمایئے! اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حیران ہو کر پوچھا کہ مِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ حضور! کیا اس زمانے میں ہماری تعداد بہت کم رہ جائے گی؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نہیں! ((بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ)) تعداد تو تمہاری بہت ہوگی' نوے کروڑ' ایک ارب اور نہ معلوم کتنی! لیکن تمہاری حیثیت جھاگ سے زیادہ نہ ہوگی کہ جیسے کسی جگہ اگر سیلاب آ جائے تو سیلاب میں پانی کے ریلے کے اوپر کچھ جھاڑ جھنکار ہوتا ہے' کچھ جھاگ ہوتا ہے ((وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ)) اس سے زائد تمہاری حیثیت نہیں ہوگی' دنیا میں تمہاری اہمیت اس سے بڑھ کر نہ رہے گی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پھر سوال کیا کہ حضور! ایسا کیوں ہو جائے گا؟ آپؐ نے فرمایا: تمہارے اندر ایک بیماری پیدا ہو جائے گی جس کا نام ''وھن'' ہے۔ سوال کیا گیا: ''مَا الْوَهْنُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ'' کہ حضورؐ! وہ وہن کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ((حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ)) دنیا کی محبت اور موت سے نفرت —— یہ بیماری جب تم میں پیدا ہو جائے گی' جب دنیا تمہاری محبت کا مرکز بن جائے گی اور موت سے تم دور بھاگنے لگو گے تو بہت بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود تم اقوامِ عالم کے لیے لقمۂ تر بن جاؤ گے —— لیکن ظاہر بات ہے کہ کوئی اپنی درازئ عمر کے باعث اللہ کی پکڑ سے بہر حال بچ نہیں سکے گا' اسے بالآخر اپنے ربّ کی طرف لوٹنا ہی ہوگا اور وہاں اس کا حساب چکا دیا جائے گا۔

یہاں اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا حصہ مکمل ہوا جو چار آیات پر مشتمل ہے۔ ان میں ذکر اگرچہ سابقہ اُمت مسلمہ یہود کا ہے' لیکن اصلاً یہ ایک آئینہ ہے کہ جس میں نئی اُمت مسلمہ کو آئندہ کی تصویر دکھائی جا رہی ہے کہ جیسے وہ حاملِ کتاب بنائے گئے تھے اس طرح تم بھی حامل قرآن بنائے جا رہے ہو' جیسے وہ وارثِ کتاب بنے تھے ویسے ہی تم بھی وارثِ کتاب بنائے گئے ہو' دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ جو معاملہ انہوں نے کیا تھا تم بھی قرآن کے ساتھ وہی سلوک کرنے لگو!! یہ ہے درحقیقت اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے اور دوسرے حصے کے مابین ربط و تعلق۔ چونکہ انقلابِ محمدیؐ کا آلہ قرآن حکیم ہے اور حضور ﷺ کی بعثت قیامت تک آنے والی پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے' لہٰذا جس عمل کو حضور ﷺ نے جاری رکھا ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ اور جس کی بنیاد پر ایک ہمہ گیر انقلاب جزیرہ نمائے عرب میں برپا کر دیا' اسی عمل کو جاری رکھنا اور آگے چلانا اُمت کی ذمہ داری ہے۔

اس کے لیے اساسی منہاج وہی ہوگا جو نبی اکرم ﷺ نے اختیار کیا' جس میں مرکز و محور کی حیثیت قرآن حکیم کو حاصل تھی۔ یہاں سورۃ الجمعہ کا پہلا رکوع ختم ہوا۔

حکمت و احکامِ جمعہ

سورۃ الجمعہ کا دوسرا رکوع تین آیات پر مشتمل ہے اور اس میں حکمت و احکامِ جمعہ کا بیان ہے۔ یہاں ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ اس سورۂ مبارکہ کے مرکزی مضمون اور عمود کے ساتھ نظامِ جمعہ کا کیا تعلق ہے۔ اس لیے کہ بظاہر تو معاملہ غیر متعلق سا نظر آتا ہے! —— تاہم پہلے ان آیات کا ایک رواں ترجمہ کر لینا مفید ہوگا۔ فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۹﴾

''اے اہل ایمان! جب تمہیں پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو لپکو اللہ کی یاد کی طرف اور کاروبار چھوڑ دو! یہی بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھو۔''

ذہن میں تازہ کیجیے' سورۃ الصّف کا دوسرا رکوع بھی شروع ہوا تھا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا﴾ کے الفاظ سے اور اس میں بھی یہ الفاظ وارد ہوئے تھے کہ ﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

(۱)

اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾

یہ مشابہت لفظی بھی بہت قابل توجہ ہے۔ آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانۡتَشِرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا رَاَوۡا تِجَارَةً اَوۡ لَهۡوَا ۨانْفَضُّوۡۤا اِلَيۡهَا وَتَرَكُوۡكَ قَآئِمًا ؕ قُلۡ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ مِّنَ اللَّهۡوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ﴿۱۱﴾﴾

''جب نماز ادا کی جائے چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو' اور اللہ کا ذکر جاری رکھو کثرت کے ساتھ' تا کہ تم فلاح پاؤ۔ (اب ایک متعین واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) جب انہوں نے دیکھا کوئی کاروبار یا کوئی اور دلچسپی کی چیز تو وہ اس کی طرف لپک گئے اور چھوڑ گئے آپ کو (اے نبیؐ) کھڑے ہوئے۔ کہہ دیجیے جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر ہے تجارت سے بھی اور دلچسپیوں کی چیزوں (لہو ولعب) سے بھی' اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔''

ان تین آیات میں' جیسا کہ ترجمے سے واضح ہو گیا' ساری بات نمازِ جمعہ اور خطبۂ جمعہ کی ہو رہی ہے۔ جمعہ کی فرضیت اس درجے واضح کی گئی کہ صریحاً فرما دیا گیا کہ جب جمعہ کی اذان ہو جائے تو ہر نوع کا کاروبارِ دنیوی ترک کر دیا جائے' ہمہ تن متوجہ ہو جایا جائے! یہ ساری باتیں جو آ رہی ہیں تو پہلے جیسا کہ عرض کیا گیا تھا یہ سمجھئے کہ اس کا ربط کیا ہے۔

رہ گئی رسم اذاں......

درحقیقت یہ نظامِ جمعہ جس کو ہم نے ایک رسم بنا لیا' ایک نہایت عظیم اور مبنی بر حکمت نظام ہے۔ اس معاملے میں تو شاید مسلمانوں کو دنیا کی کوئی قوم بھی مات نہ دے سکے کہ بڑی سے بڑی چیز کو ایک رسم بنا کر رکھ دینا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے__ نتیجہ یہ ہے کہ اعمال کی محض صورت اور شکل باقی رہ جاتی ہے اور اس کی روح غائب! یہ بات نظروں کے سامنے رہتی ہی نہیں کہ وہ عمل کس لیے تھا' اس کا مقصد کیا تھا؟ بس عمل کی ظاہری صورت باقی رہتی ہے اور اس کی حیثیت ایک رسم (Ritual) سے زیادہ نہیں ہوتی۔

رہ گئی رسم اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی!

اسی طرح کا معاملہ اجتماعِ جمعہ کا ہے۔ آج اس گئے گزرے دَور میں بھی مسلمانوں میں ابھی کثیر تعداد میں وہ لوگ موجود ہیں جو جمعہ کے لیے بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آتے ہیں' نہا دھو کر' اچھے صاف ستھرے کپڑے پہن کر' خوشبو لگا کر آتے ہیں' لیکن یہ بات بالعموم پیشِ نظر نہیں ہوتی کہ اس نظامِ جمعہ کا اور اس سب اہتمام کا حاصل کیا ہے' اس کی غرض وغایت کیا ہے' اس کی حکمت کیا ہے!____ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اس جمعہ کی اصل اہمیت خطبہ جمعہ کی وجہ سے ہے' ورنہ جمعہ کی نماز میں فرض رکعتوں کی تعداد نمازِ ظہر سے بھی نصف رہ جاتی ہے جس کا کہ وہ قائم مقام بنتی ہے۔ نمازِ ظہر کی چار رکعتیں ہیں جب کہ نمازِ جمعہ میں کل دو رکعات فرض شامل ہیں۔ گویا نماز کی رکعتوں کی تعداد کم ہو گئی۔ جمعہ کو جس چیز نے ''جمعہ'' بنایا ہے وہ خطبہ جمعہ ہے' اور خطبہ جمعہ کی غرض وغایت کیا ہے' اسے مسلم شریف کی ایک روایت کے حوالے سے سمجھئے کہ حضورﷺ خطبہ جمعہ میں کیا کیا کرتے تھے؟____ ''كَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَءُ الْقُرْآنَ وَيُذَكِّرُ النَّاسَ''____ ''آپﷺ قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے اور لوگوں کو تذکیر فرماتے تھے'' یاددہانی کیا کرتے تھے۔ یہ تذکیر بالقرآن وہی ہے جس کا ذکر سورۂ ق کی آخری آیت میں آیا ہے: ﴿فَذَكِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مَنۡ يَّخَافُ وَعِيۡدِ﴾ یعنی ''اے نبی! اس قرآن کے ذریعے سے تذکیر فرمائیے (اور یاددہانی کراتے رہیے) ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہو''۔

حکمت جمعہ

خطبہ جمعہ دراصل عوامی سطح پر تذکیر بالقرآن ہی کی ایک ہمہ گیر شکل ہے۔ یہ گویا

تعلیم بالغاں کا ایک عظیم نظام ہے جو اُمت میں رائج کیا گیا کہ کوئی نائب رسول منبر رسولؐ پر کھڑا ہو کر اور قرآن حکیم کی آیات کے ذریعے تذکیر ونصیحت کا وہی فریضہ سرانجام دے جو درحقیقت انقلاب محمدﷺ کی جڑ اور بنیاد ہی نہیں، مرکز ومحور بھی ہے۔ یعنی ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ اسی نبوی عمل کو دوام بخشا گیا اور اسے اُمت کے اندر ایک مستقل عمل کی حیثیت سے جاری کر دیا گیا نظامِ جمعہ کی صورت میں، کہ لوگ خطبہ سننے کے لیے پورے اہتمام سے نہا دھو کر آئیں، اعصاب چاق وچوبند ہوں، ماحول معطر ہو۔ غور کیجیے، یہ ساری ہدایات کیوں دی گئیں! نبی اکرمﷺ نے اس معاملے میں یہاں تک فرمایا کہ کیا تمہارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ تم اپنے ان کپڑوں کو جو محنت مزدوری کے وقت پہنتے ہو، علیحدہ رکھو اور جمعہ کے لیے ایک صاف ستھرا جوڑا علیحدہ تیار رکھو؟ تاکہ جب مسلمان جمع ہوں تو وہاں کا ماحول پسینے کی بدبو سے منغص نہ ہو بلکہ پاک صاف اور معطر ماحول ہو کہ مسلمان خطبہ جمعہ پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ سن سکیں اور کوئی نائب رسول جب عمل نبویؐ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے آیاتِ قرآنی کے ذریعے سے وعظ ونصیحت کرے تو ان باتوں کو سننے اور سمجھنے کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکے۔

ہفتہ وار اجتماعات کی ضرورت

یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ ہر انقلابی جماعت کے لیے اس طرح کے اجتماعات کا اہتمام کرنا ایک لازمی امر ہے۔ ہر انقلابی گروہ یا جماعت کا کوئی نہ کوئی لٹریچر ہوتا ہے جو اس کے اساسی افکار ونظریات پر مشتمل ہوتا ہے اور کسی بھی انقلابی گروہ یا جماعت کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے اساسی لٹریچر کے ساتھ اپنے ذہنی ربط وتعلق کو برقرار رکھے اور اس لٹریچر کے ذریعے وقتاً فوقتاً اپنے افکار ونظریات کو تازہ کرتی رہے۔ مختلف جماعتیں اسی غرض سے ہفتہ وار اجتماعات کا اہتمام کیا کرتی ہیں۔ مسلمان بھی دراصل ایک نظریاتی گروہ کے افراد ہیں۔ اس گروہ یا اُمت کے سامنے ایک عظیم مشن ہے، فرائض رسالت کی ادائیگی کی ذمہ داری اسی اُمت کے کاندھوں پر آئی ہے، انقلابِ نبویؐ کی عالمی سطح پر تکمیل اُمت کا مشن قرار پایا ہے اور اس انقلابی جماعت کا لٹریچر ہے قرآن مجید۔ ان کے فکر کو تازہ کرنے اور ان کے نقطۂ نظر کو صحیح رکھنے کے لیے اس ابدی لٹریچر کی پیہم اور مسلسل تعلیم کا نظام جاری کر دیا گیا خطبہ جمعہ کی شکل میں۔ اس خطبے کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ فرمایا گیا کہ جب امام خطبہ دے رہا ہو تو ایک دوسرے سے کلام نہ کرو، یہاں تک کہ دورانِ خطبہ اگر تم نے اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ خاموش رہو تو اتنا کہنا بھی ایک ناپسندیدہ حرکت ہے۔ ((اِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ اَنْصِتْ فَقَدْ لَغَوْتَ)) کہ اگر کسی نے کوئی لغو حرکت کی کہ دورانِ خطبہ بولنا شروع کر دیا اور تم نے اس سے کہا کہ ''چپ ہو جاؤ'' تو تم نے بھی ایک لغو حرکت کا ارتکاب کیا۔ پوری خاموشی کے ساتھ ہمہ تن متوجہ ہو کر سنو۔ اللہ کے پاک کلام کی جو تعلیم وتلقین ہو رہی ہے اور اس کے ذریعے سے جو تذکیر ونصیحت کا عمل خطبے کی صورت میں جاری ہے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاؤ!

خطبۂ جمعہ کی اہمیت کا اندازہ حضورﷺ کے اس فرمان سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب خطبے کا آغاز ہو جاتا ہے تو وہ فرشتے کہ جو مسجد کے دروازوں پر بیٹھے آنے والوں کی حاضری کا اندراج کر رہے ہوتے ہیں، اپنے صحیفے اور رجسٹر بند کر دیتے ہیں اور وہ خود ہمہ تن خطبے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جمعہ میں صرف وہی لوگ حاضر شمار ہوتے ہیں جو وقت پر آئیں اور مکمل خطبے کی سماعت کریں۔ ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ اوّل تو وہ خطبہ عربی زبان میں ہے اور ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ع زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم! ـــــ اس کی تلافی کے لیے اگر تقریروں اور وعظوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تو بڑے دکھ کے ساتھ یہ عرض کر رہا ہوں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان تقریروں میں اور سب کچھ ہوتا ہے سوائے قرآن کے! اس میں سیاست پر بات ہوگی، فرقہ واریت پر گرما گرم گفتگو ہوگی، اس میں کہانیاں ہوں گی، لطیفے بیان ہوں گے، نہیں ہوگا تو بس قرآن نہیں ہوگا جس کے لیے یہ سارا نظام تجویز کیا گیا! جس کے لیے

---

(۱)

یہ سارا لکھیڑ مول لیا گیا ہے!

یہ ہے حکمت و احکامِ جمعہ کا مضمون جو اس سورۂ مبارکہ میں بڑی جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔ جمعہ سے متعلق احکام دوسرے رکوع میں وارد ہوئے اور اس کی حکمت کا بیان گویا پہلے رکوع میں ہو گیا کہ وہی نبوی عمل جس کا بیان چار اصطلاحات کی صورت میں ہوا ﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیۡہِمۡ وَیُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ﴾ اس کو دوام اور تسلسل عطا کر دیا گیا خطبہ جمعہ کی شکل میں۔ بلاشبہ یہ تعلیم بالغاں کا ایک عظیم نظام ہے۔ چشمِ تصور سے دیکھئے آج اس گئے گزرے دَور میں بھی لاکھوں انسان جمعہ کے لیے بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آتے ہیں ع ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی''۔ افسوس کہ یہ عظیم عمارت فی الواقع اب کھنڈر بن چکی ہے۔ اس کی حکمت اور اس کی غرض و غایت ہمارے پیشِ نظر ہی نہیں رہی' جمعہ اب ہمارے ہاں بس ایک رسم بن کر رہ گیا ہے اور اس کو رسم کی حیثیت سے ادا کرنے والے آج بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن ہماری کوتاہی کے باعث اس سے وہ مقصود حاصل نہیں رہا جو کہ اس مبارک عبادت سے حاصل ہونا چاہیے۔

احکامِ جمعہ — بعض دیگر ہدایات

بہر کیف یہ ہے وہ ربط و تعلق جو دوسرے رکوع کی تین آیات کا اس سورۂ مبارکہ کے عمود کے ساتھ بنتا ہے۔ اس دوسرے رکوع میں بعض مضامین اور بھی ہیں جو اگرچہ سورۃ کے عمود اور ربطِ کلام کے اعتبار سے ضمنی قرار پائیں گے لیکن بہرحال ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ علم و حکمت کا ایک قیمتی موتی ہے۔ ایک تو خطبہ جمعہ کی خصوصی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ﴾ کہ لپکو اللہ کے ذکر کی طرف! — خیال رہے کہ نماز کے لیے دوڑ کر جانے سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے' یہ وقار کے منافی ہے۔ ورنہ یہاں لفظی ترجمہ تو یہی ہو گا کہ دوڑو اللہ کی یاد کی طرف۔ لیکن ہم اس سے مراد لیں گے کہ پوری مستعدی کے ساتھ ہمہ تن متوجہ ہو جاؤ۔

اگلے الفاظ بھی نہایت قابل توجہ ہیں ''وَذَرُوا الۡبَیۡعَ'' کاروبار ترک کر دو! ''وَذَرُوا'' امر کا صیغہ ہے اور یہ قاعدہ سب کے علم میں ہے کہ ''اَلۡاَمۡرُ لِلۡوُجُوۡبِ''۔ چنانچہ اذانِ جمعہ کے بعد کاروبارِ دنیوی مطلقاً حرام ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ ذہن میں رہے کہ یہ حکم اصلاً اذانِ ثانی سے متعلق ہے' اس لیے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں ایک ہی اذان ہوتی تھی۔ دوسری اذان کا اضافہ حضرت عثمان ؓ کے عہدِ خلافت میں کیا گیا جب مدینہ منورہ نے وسعت اختیار کر لی۔ لہٰذا اس حکم کا پوری شدت کے ساتھ اطلاق تو ہو گا اذانِ ثانی کے بعد' لیکن تبعاً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اذانِ اولیٰ کے بعد جمعہ کی تیاری کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو جانا اور مسجد کی طرف لپکنا اس آیت کے منشا میں شامل ہے۔

اس آیت میں لفظ ''ذکر'' بھی خصوصی طور پر لائق توجہ ہے۔ یہاں ذکر سے مراد ہے خطبہ جمعہ۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' خطبہ دراصل قرآن کی تعلیم ہی کا ایک ذریعہ ہے۔ خطیب کا کام یہ ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے حوالے سے تذکیر کرے' وعظ و نصیحت کرے۔ اور قرآن مجید خود اپنے آپ کو ''الذِّکر'' قرار دیتا ہے۔ سورۃ الحجر کی اس آیت میں بھی جو کثرت سے بیان کی جاتی ہے' قرآن کے لیے ''الذِّکر'' کا لفظ آیا ہے:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ (الحجر)

''یقیناً ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں''۔

اُمتِ مسلمہ کے لیے خصوصی سہولت

اس کے بعد فرمایا جب نمازِ جمعہ سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں پھیل جاؤ۔ ﴿فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانۡتَشِرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ﴾ اس حکم کا پس منظر یہ ہے کہ سابقہ اُمت میں یوم السبت (ہفتے کا دن) کُل کا کُل عبادات کے لیے مخصوص تھا اور اس میں کاروبارِ دنیوی مطلقاً حرام تھا۔ لیکن اُمتِ محمد ﷺ کے لیے اس معاملے میں آسانی پیدا کی گئی ہے اور وہ یہ کہ صرف اذانِ جمعہ سے لے کر اختتامِ نماز تک دُنیوی کاروبار اور تجارتی لین دین کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اجازت دے دی گئی کہ جب نماز ادا ہو

چکے تو اب تمہیں اختیار ہے کہ جاؤ اور تلاشِ معاش میں مصروف ہو جاؤ۔ اس ضمن میں جو الفاظ یہاں لائے گئے ہیں وہ نوٹ کرنے کے قابل ہیں۔ فرمایا: ﴿وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ کہ جو کچھ تم کماؤ گے اسے اللہ کا فضل سمجھو' اسے اپنی محنت کا نتیجہ سمجھنا درست نہ ہو گا۔ محنت یقیناً تمہیں کرنی ہے' لیکن جو رزق اور روزی تمہیں عطا ہوئی ہے یہ اللہ کا فضل ہے۔ ایک بندۂ مؤمن کا نقطۂ نظر یہی ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی تاکید فرما دی: ﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد بھی اللہ کا ذکر جاری رہنا چاہیے۔ اپنے تمام اوقات کو ذکر الٰہی سے آباد رکھنے کی کوشش کرو——— ''اللہ کو کثرت کے ساتھ یاد رکھو تا کہ تم فلاح پاؤ''۔ دوامِ ذکر کی بڑی فضیلت ہے۔ ''اِسْتِحْضَارُ اللّٰهِ فِي الْقَلْبِ'' یعنی اللہ کی یاد کو دل میں تازہ رکھنا پسندیدہ ہی نہیں مطلوب بھی ہے۔ اور یہاں تو اسے فلاح کے لیے بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آخری آیات کے حوالے سے ذکر کے مفہوم پر کچھ باتیں قدرے تفصیل سے عرض کی جا چکی ہیں' ان کو ذہن میں تازہ کیجیے!

اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت میں ایک متعین واقعے کے حوالے سے تنقید کر کے خطبہ جمعہ کی اہمیت کو مزید واضح کر دیا گیا کہ خطیب جب خطبہ دے رہا ہو تو اس حال میں اسے چھوڑ کر کسی تجارتی لین دین یا کسی دیگر مصروفیت کی جانب متوجہ ہو جانا نہایت نامناسب طرزِ عمل ہے' خواہ کسی اشد ضرورت کے تحت یہ معاملہ کیا گیا ہو۔ مختصراً یہ کہ سورۂ مبارکہ گویا گھوم رہی ہے اس مرکزی آیۂ مبارکہ کے گرد: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ اور یہی ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا بنیادی طریق کار اور انقلابِ محمدیؐ کا اساسی منہاج!

بارك الله لی ولكم فی القرآن العظيم ونفعنی واياكم بالآيات والذكر الحكيم